

مسیح ابن اللہ

انجیل مقدس میں "ابن اللہ" ایک ایسا لقب ہے جو خصوصیت کے ساتھ مسیح کلمۃ اللہ کے لئے مستعمل ہے لیکن یہ خطاب اہلِ اسلام کو اس قدر ناگوارِ خاطر رہا کہ اس کے معنوی پہلو کو نظر انداز کر دیا۔ بدیں اعتراض کہ "جب خدا کی جورو نہیں تو پھر مسیح عیسیٰ خدا کے بیٹے کیونکر ہو سکتے ہیں؟"

جلالی لقب

اگرچہ یہ مناسب نہیں کہ ہم دلالتِ لفظی پر بحث کریں تاہم یہ کہنا غیر موزوں نہ ہوگا کہ لفظ کی کچھ حقیقت نہیں ہوتی وہ محض ایک مجہول و ساختہ نشان ہے جس کے ذریعہ ہم کسی تصور کا اظہار کرتے ہیں مثلاً ضرورت سے زیادہ زمانہ ساز کو ابن الوقت کہا جاتا ہے لیکن کیا ہم اس سے یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ فلاں زمانہ ساز کسی "شخص" وقت نامی کے صلب سے پیدا ہوا ہے؟ ہرگز نہیں۔ اس لئے کہ لفظ ابن الوقت ایک خاص تصور کے لئے وضع کیا گیا ہے جو اپنے معنوں میں نازیبا اور معیوب نہیں پس جس طرح ابن الوقت کا ایک خاص مطلب ہے اسی طرح ابن اللہ کے ایک خاص معنے ہیں جن کا مادی تصور کے ساتھ کچھ واسطہ نہیں بلکہ اس جلالی لقب سے ہم یسوع مسیح کی الوہیت تسلیم کرتے ہیں۔

کوزہ میں دریا

چنانچہ کلمۃ اللہ نے فرمایا کہ "میں اور باپ ایک ہیں" اور "میں باپ میں ہوں اور باپ مجھ میں ہے" اور کہ "میں خدا میں سے نکلا اور آیا ہوں"۔ اس روحانی تعلق کو جس کے اظہار کرنے میں زبان قاصر تھی۔ اسے انجیل حمیدہ نے "ابن اللہ" کے لطیف استعارہ میں سمجھا کر گویا

مسیح ابن اللہ

ڈاکٹر پادری

ایچ۔ ایم۔ درانی

دریا کو کوزے میں بند کر دیا پس کلمۃ اللہ ان معنوں میں خدا کا بیٹا نہیں جن معنوں میں اولادِ آدم ہے۔ بلکہ وہ اس معنی میں ابن کہلاتا ہے کہ وہ "خدا سے نکلا" اور چونکہ کلمۃ اللہ کا ظہور ذاتِ واجب سے ہے۔ اس لئے کلامِ مقدس میں آپ کو "خدا کے جلال کا پرتو اور اُس کی ذات کا نقش اور مثالی طور پر "اکلوتا بیٹا" کہا گیا ہے۔

خدا نور ہے

چنانچہ قرآن میں خدا کے لئے آیا ہے لیس کمثلہ شئی۔ اس پر بھی سورۃ نور میں خدا کو روشنی سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اللہ نور السمٰوات والارض مثل نورہ کمشکوٰۃ فیھا مصباح المصباح فی زجاجۃ الزجاجۃ کانھا کوکب دری یوقد من شجرۃ مبارکۃ زیتونۃ لا شرقیۃ ولا غربیۃ یکاد زیتھا یضیٓ ولو لم تمسسہ نار نور علیٰ نور یھدی اللہ لنورہ من یشاء و یضرب اللہ الامثال للناس۔ یعنی اللہ آسمان اور زمین کا نور ہے اور اُس کے نور کی مثال ایسی ہے۔ جیسے کہ طاق ہو اور طاق میں ایک چراغ رکھا ہے۔ اور چراغ ایک شیشے کی قندیل میں ہے اور قندیل اس قدر شفاف ہے کہ گویا وہ موتی کی طرح چمکتا ہوا ایک ستارہ ہے اور چراغ زیتون کے ایک مبارک درخت کے تیل سے روشن کیا جاتا ہے۔ جو نہ پورب کے رُخ واقع ہے اور نہ پچھم کے رُخ۔ اُس کا تیل اس قدر صاف ہے کہ اگر اُس کو آگ نہ بھی چھوئے تاہم معلوم ہوتا ہے کہ آپ سے آپ جل اُٹھیگا۔ غرض کہ نور پر نور ہے اور اللہ اپنے نور کی طرف جسکو چاہتا ہے راہ دکھاتا ہے اور اللہ لوگوں کے لئے مثالیں بیان فرماتا ہے"۔

یہ ہے قرآن کی پوری عبارت مگر آج تک کسی مسلمان نے اس سے یہ نہیں سمجھا کہ خدا واقعی ایک روشنی ہے، جو قندیل کی طرح کسی طاق میں رکھی ہے اور روغن

زیتون سے جل رہی ہے۔ مگر حیرت ہے کہ جب کبھی کسی مسیحی کی زبان سے "خدا کا بیٹا" سن لیتے ہیں۔ تو اُن کا ذہن ولادت کی طرف دوڑ جاتا ہے حالانکہ جب کبھی انسانی محاورہ کا اطلاق خدا تعالےٰ پر کیا جاتا ہے۔ تو تمثیلاً یا استعارۃً ہوا کرتا ہے۔ ہماری زبان میں ایسے الفاظ کا مفہوم جو ہمارے لئے ہوا کرتا ہے وہی مفہوم ذاتِ باری کے لئے بھی سمجھنا سخت غلطی ہے۔ اس لئے مادی اور دنیوی خیال کا اطلاق آسمانی تعلقات پر عاید نہیں ہو سکتا۔ پس چاہیئے کہ "مسیح ابن اللہ" کے الٰہی تصور کے لئے "عالم بالا کی چیزوں کے خیال میں مشغول رہیں نہ کہ زمین کی"۔

امہات المومنین

مثال کے طور پر میں مسلمانوں کو یاد دلاتا ہوں کہ قرآن میں آنحضرت کی ازواج مطہرات کو "امہات المومنین" کہا گیا ہے۔ لیکن کیا ہم اس وجہ سے اُنہیں مسلمانوں کی مائیں سمجھ لیں کہ وہ فی الواقع نبی کی بیویوں کے بطن سے پیدا ہوئے ہیں؟ حالانکہ خود قرآن مجید نے اس خیال کی تردید بدیں الفاظ کر دی ہے کہ "مائیں تو وہی ہیں جنہوں نے اُن کو جنا"۔ (سورہ مجادلہ) پھر نبی کی بیویاں کیونکر مسلمانوں کی مائیں ٹھہرائی گئیں؟ کیا یہ عقدہ لاینحل نہیں؟ ہاں ضرور ہے۔ بشرطیکہ اس کے نورانی پہلو کو نظر انداز کیا جائے۔ اور کیا حضرت منصور نے "انا الحق" حضرت بایزید بسطامی نے "من خدا ام من خدا" اور حضرت محی الدین ابن العربی نے "لا الٰہ الا انا" کہہ کر کسی مادی تعلق کا مظاہرہ کیا تھا۔

سمیع والبصیر

اس ضمن میں ہمیں ایک اور مثال کا ذکر کرنا ہے اور وہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں خدا کو "سمیع اور بصیر" کے القاب سے ملقب کیا گیا ہے۔ لیکن کیا ہم خدا کو انسان کی طرح صاحبِ جسم اس وجہ سے تسلیم

کرلیں کہ ذاتِ خداوندی سے "سُننے" اور "دیکھنے" کی صفات منسوب کی گئی ہیں
نہیں قطعاً نہیں۔ اس لئے ہم خدا تعالےٰ کے قول و فعل سے وُہی امید نہیں رکھ
سکتے جو انسان کے قول و فعل سے ہوتی ہے۔ اور [illegible] قرآن میں خدا سے
منسوب کئے گئے ہیں۔ وہ مثالی ہیں۔ گو خداوند تعالےٰ صاحبِ اعضا نہیں تاہم
اُس میں اتنی قدرت ہے کہ وہ بغیر آنکھ کے دیکھ سکتا ہے۔ اور بغیر کان کے
سُن سکتا ہے۔ اسی طرح خدا بغیر جورو کے بیٹا رکھتا ہے جو نہ جسم کی خوا... سے
نہ خون سے پیدا ہوا ہے۔ بلکہ وہ "خدا سے نکلا ہے۔"

الٰہی عطیہ کلامِ مقدس میں بطورِ پیشگوئی اس معرفت کا اول بیان آیا ہے
کہ "ہم کو ایک بیٹا بخشا گیا اور سلطنت اس کے کاندھے پر ہوگی اور وہ اس نام سے کہلاتا
ہے عجیب مشیر خدائے قادر ابدیت کا باپ اور سلامتی کا شہزادہ" (یسعیاہ ۱:۹)
سے ظاہر ہے کہ وہ مخلوق نہیں بلکہ الٰہی عطیہ ہے۔ البتہ اسکی بشریت مخلوق تھی اور ابن اللہ نے
اس بشریت کے جامہ کو معجزانہ طور پر پہنا لہذا بشریت ظرف تھی اور ابن اللہ اس کا مظروف
یعنی انسانیت کے لحاظ سے وہ ابنِ مریم ہے اور الوہیت کے لحاظ سے وہ ابن
اللہ ہے۔ اس وجہ سے کلمۃ اللہ نے فرمایا کہ میں خدا میں سے نکلا اور آیا ہوں (یوحنا ۸:۴۲)
"پیشتر اس سے کہ ابراہیم پیدا ہوا۔ میں ہوں"۔ (یوحنا ۸:۵۸)
یاں ہم ابن اللہ اگرچہ خدا کی صورت پر تھا۔ لیکن "انسانی شکل میں ظاہر ہوکر اپنے
آپ کو پست کردیا۔ اور یہاں تک فرمانبردار رہا کہ موت بلکہ صلیبی موت گوارا کی" شہنشاہوں کا
شہنشاہ ہوکر ہم بے نواؤں کی خدمت کرنے کیلئے آیا۔ مالک ہوتے ہوئے خادم کی صورت اختیار
کی تاکہ ہمیں مالامال کرے۔ اگرچہ وہ ابن اللہ تھا مگر ابن مریم بن گیا تاکہ ہمیں بھی خدا کے
فرزند ہونے کا استحقاق بخشے۔ پس کلمۃ اللہ انسان ہونے کی وجہ سے ابن اللہ نہیں بلکہ
ابن اللہ ہونے کی وجہ سے انسان اور آسمانی بادشاہت کا سلطان ہے۔

بیٹے سے مراد کلامِ مقدس میں لفظ "باپ" اور "بیٹا" کا استعمال منقولِ شرعی کی قبیل سے
ہے۔ باپ سے مراد ماں کا شوہر نہیں اور نہ بیٹے سے مراد جورو کا بیٹا ہے بلکہ یہ لقب خدا
اور مسیح کا باہمی نسبت و اضافت ظاہر کرتے ہیں۔ اگر مفہوم ذات واجب تعالیٰ کا مقید
بالفاظ ہو سکے اور اعتراض صرف اصطلاح پر جائز ہو۔ تو خدا تعالیٰ کو سمیع و بصیر کہنے سے اُس کے
کان اور آنکھ اور وجہ اللہ کہنے سے اس کے دانت، زبان اور نقوش ظاہری اور یدِ اللہ
کہنے سے ہتھیلی اور انگلیوں وغیرہ کا وجود لازم آئیگا۔ لیکن جیسے کہ اُس کے منہ، ہاتھ وغیرہ سے
ہمارے جیسے منہ، ہاتھ مراد نہیں بلکہ اُن کا مفہوم وہی ہے جو اُس کی الوہیت کی شان کے
شایاں ہے۔ لیکن اگر کوئی یہ کہے کہ اس طرح سے وہ بے مثل نہیں رہتا۔ تو یہ غلطی ہے مثل
اور مثال میں فرق نہ سمجھنے کی وجہ سے ہے۔ خدا تعالیٰ کے لئے مثل بیشک ممتنع ہے
لیکن مثال جائز ہے۔ چنانچہ قرآن شریف میں خدا کو نور کہا گیا ہے اور "نور" کو "طاق
کے چراغ" سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اور اسی طرح خدا کو مالک، حاکم اور بادشاہ کہا جاتا
ہے۔ باوجودیکہ انہیں القاب سے انسان کو بھی ملقب کیا جاتا ہے۔
ان مثالوں کو آپ کے سامنے پیش کرنے سے صرف یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ خدائے
تعالیٰ مطلق چونکہ روح ہے۔ یعنی انسان کی طرح صاحبِ جسم نہیں اور نہ ہی انسان کے سے
خیالات، خواہشات اور جذبات رکھتا ہے۔ اسلئے سیدنا المسیح کی ابنیت جسمانی نہیں ہو
سکتی۔ لہذا معلوم ہوا کہ "جو جسم سے پیدا ہوا جسم ہے۔ اور جو روح سے پیدا ہوا روح ہے۔"
لیکن چونکہ کلمۃ اللہ خدا سے نکلا ہے۔ اس لئے وہ بحیثیت ذات خدا سے خدا ہے اور
بحیثیت مجسم کامل انسان ہے۔

ازلی بیٹا کلامِ مقدس میں کہیں ایسا اشارہ نہیں پایا جاتا کہ یسوع مسیح خدا کا جسمانی
بیٹا ہے اور نہ یہ کہ جب خدا تھا ابن اللہ نہ تھا جس طرح "خدا باپ" کا شروع نہیں
اسی طرح "خدائے ابن" کا کوئی شروع نہیں اگرچہ ہمارے جسمانی رشتہ میں ایک زمانہ پایا

جاتا ہے یعنی قدامت میں پہلے باپ ہوتا ہے اور بعد میں بیٹا۔ نیز مرتبہ میں باپ اعلےٰ تصوّر کیا جاتا ہے لیکن کلمۃ اللہ کی ابنیّت اور اولادِ آدم کی ابنیت میں یہی ایک بیّن فرق ہے کہ وہ ازلی قائم بالذات اللہ تعالیٰ ہے اور کہ "دنیا کی پیدائش کا وسیلہ ہے" ابتدا میں کلمہ تھا اور کلمہ خدا کے ساتھ تھا اور کلمہ خدا تھا اور ساری چیزیں اُس کے وسیلہ سے پیدا ہوئیں۔ اور جو کچھ پیدا ہوا اُن میں سے کوئی چیز بھی اُس کے بغیر پیدا نہیں ہوئی" با الفاظ دیگر ازلی خدا کے ساتھ کلمہ محیطِ زماں ہے اور جو شے محیطِ زماں ہو۔ اُس پر تقدّم و تاخّر کا اطلاق عائد نہیں ہو سکتا۔ چونکہ باپ اور بیٹا ہم ذات اور ہم جوہر ہیں اس لئے باپ اور بیٹے کی ماہیّت میں غیریت کا سوال اٹھنا عقلاً محال ہے لہٰذا لفظ باپ اور بیٹے میں مغائرت لفظی ہے نہ کہ ماہیتی۔

پدر نور و پسر نور ریست مشہور   ازیں جا فہم کن نورٌ علیٰ نور

دو حیثیتیں چنانچہ ہم ثالوث اقدس کے اقنومِ ثانی کلمۃ اللہ کو محض ازلی اور غیر محدود ہی نہیں مانتے بلکہ "باپ" اور "روح القدس" کے ساتھ خدائے واحد یقین کرتے ہیں۔ نہ ذاتِ واجب میں کلمۃ اللہ کی ازلی الوہیّت کے ساتھ اُس کی انسانیت کے قائل ہیں۔ اور نہ اس ازلی اقنوم کو ازلی انسان کہتے ہیں۔ بلکہ یسوع مسیح میں الوہیت و انسانیت دو ذاتوں کا اتحاد بطورِ ترکیب و تحلیل نہیں بلکہ بطورِ ظاہر و مظہر مانتے ہیں۔ انہیں سے اُس کی الوہیت کو ازلی و بے حد مانتے ہیں۔ اور اس کی انسانیت کو محدود اور حادث۔ پس نتیجہ صاف ہے کہ مسیحی مسلمات کے مطابق کلمۃ اللہ کی دو حیثیتیں ہیں۔ یعنی کلمۃ اللہ (ابن اللہ) اور کلمہ مجسّم (ابنِ مریم)۔

بائبل مقدس کے الفاظ میں یہ امتیاز یوں ہے کہ اقنومِ ثانی ہونے کے لحاظ سے وہ کلامِ خدا ہے (یوحنا ۱:۱) اکلوتا بیٹا (یوحنا ۱:۱۴) کائنات کی پیدائش کا وسیلہ (یوحنا ۱:۳)۔ بالفاظِ دیگر ذاتِ واجب کا اقنومِ ثانی ہونے کی حیثیت میں کلمۃ اللہ چونکہ

باپ اور روح القدس سے ازلی و ذاتی اتحاد رکھتا ہے۔ اور اس لحاظ سے وہ حقیقی خدا ہے[۱] کلام مجسم ہونے کی حیثیت میں کلمۃ اللہ چونکہ انسانیت کے ساتھ حادث اور اختیاری اتحاد رکھتا ہے۔ اور اس لحاظ سے وہ حقیقی انسان ہے۔ لہٰذا مسیح کلمۃ اللہ کو جیسے ابن اللہ کہہ سکتے ہیں۔ ویسے ہی ابنِ آدم (مریم) یعنی کلامِ خدا ہوتے ہوئے انسان بھی ہے۔ مگر کلامِ خدا کو انسان نہیں کہہ سکتے۔ اس کی مثال ایسی ہے۔۔۔۔ جیسے کہ روح اور جسم دو جداگانہ ہستیوں میں مصاحبت کے علاقہ کا نام انسان ہے اور انسان کو جیسے روح کہہ سکتے ہیں مگر روح کو جسم نہیں کہہ سکتے مطلب یہ ہے کہ جس طرح انسان محض روح یا محض جسم ہونے کے بجائے ذی روح اور ذی جسم ہے۔ اسی مثال کے موافق مسیح بھی محض خدا یا محض انسان ہونے کی بجائے صاحبِ الوہیت اور صاحبِ انسانیت ہے؟

امتیازِ خصوصی غرض کہ جو ابنیّت کا رشتہ مسیح کی ذات سے تعلق رکھتا ہے وہ بے مثل ہے جو کسی مخلوق کو نصیب نہیں ہو سکتا۔ گو مجازی حیثیت سے بندگانِ خدا کو بھی ابنِ خدا کہا گیا ہے۔ بلکہ آپ کے سوا جن لوگوں کو خدا کے بیٹے کہا گیا ہے۔ اُن کو یا تو محض مخلوق ہونے کی وجہ سے یا کلمۃ اللہ کے وسیلے سے روحانی زندگی حاصل کرنے کے سبب سے۔ لیکن چونکہ مجاز کسی حقیقت سے متعلق ہوتا ہے اس لئے کلمۃ اللہ جو اس مجاز کی حقیقت اور سبب

۱۔ کلامِ مقدس سے یہ معرفت حاصل ہوتی ہے کہ ذاتِ الوہیم میں باپ بیٹا اور روح القدس تین اقنوم ہیں (متی ۲۸: ۱۹) اور ان اقانیم کا امتیاز بطونِ ذات میں ہے کسی خارجی مابہ الامتیاز کا ہرگز نہیں اور کسی بیرونی تفریق کو دخل نہیں رہا ہے۔ اقنومِ اوّل کو لفظ "باپ" اقنومِ ثانی کو "کلمہ" اور اقنومِ ثالث کو "روح القدس" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اقنومِ اوّل اس لئے باپ ہے کہ اقنومِ ثانی یعنی کلمہ اس سے صادر اور ظاہر ہوا (یوحنا ۱: ۱۸) یہی اقنومِ ثانی مولود (کلسیوں ۱: ۱۵) اور "اکلوتا بیٹا" (یوحنا ۱: ۱۸) کہلاتا ہے اور اقنومِ ثالث باپ اور بیٹے کا روح ہے (اعمال ۱۶: ۷، رومیوں ۸: ۹) اور جس طرح کلامِ مقدس میں باپ کو خدا اور خداوند کہا گیا ہے اسی طرح کلمہ یعنی بیٹے (یوحنا ۱: ۱، ۲۰: ۲۸، رومیوں ۹: ۵، عبرانیوں ۱: ۸، ۲ پطرس ۱: ۱) اور روح القدس کو (یوحنا ۴: ۲۴، اعمال ۵: ۳-۴، ۲ کرنتھیوں ۳: ۱۷) بھی خدا اور خداوند کہا گیا ہے (اثباتِ تثلیث فی التوحید صفحہ ۱۶ و ۱۷)

ہے وہی حقیقی بیٹا ہے۔

انجیل حمید سے یہ امر بصراحت ظاہر ہے کہ جب کبھی آپ نے اپنے شاگردوں سے خدا کے باپ ہونے کا ذکر کیا۔ تو عموماً اس پیرایہ میں کیا جس سے ظاہر ہو جائے کہ خدا ان کا اسی معنی میں باپ نہیں جس معنی میں آپ کا ہے۔ الغرض کلام مقدس میں کلمۃ اللہ کے سوا کسی انسان کے متعلق یہ مذکور نہیں کہ وہ خدا سے نکلا ہے یا یہ کہ پیدائش عالم کا سبب ہے اور نہ کسی انسان کا عین اکلوتا بیٹا کہا گیا ہے۔ اور لفظ اکلوتا اس امر پر دلالت صریح ہے کہ اس معنی میں کوئی اور خدا کا بیٹا نہیں کیونکہ وہ اکلوتا ہے۔

مسیح کلمۃ اللہ کی ابنیت ایک لاثانی حقیقت رکھتی ہے اول تقدس کے لحاظ سے دوئم لاثانی اختیارات کے اعتبار سے سوم اعجازی ظہور کی بناء پر چہارم آپ خود متصف بصفات ذاتِ باری تعالیٰ ہیں۔ پس اناجیل کے مطالعہ سے یہ امر بدیہی طور پر ظاہر ہے کہ کلمۃ اللہ نے اپنے لئے ابنِ خدا کا خطاب ایسے طور پر استعمال نہیں کیا جس سے یہ شبہ پیدا ہو سکے کہ یہ رشتہ خدا کے ساتھ محض جسمانی یا اخلاقی یا مذہبی تعلقات کو ظاہر کرتا ہے جو دوسرے بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ خدا باپ اور خدا ابن کا تعلق انسانی ادراک سے بہت ہی بلند اور بالا ہے اور اس رشتہ میں "باپ" اور "بیٹے" کی کامل رفاقت ظاہر ہوتی ہے اور یہ محض ایک نیا تصور ہی نہیں بلکہ ایسا تصور ہے جو ایک صریح حقیقت کا انکشاف کرتا ہے۔ مولانا روم نے کیا خوب فرمایا ہے۔

می گشت وے چند بریں روئے زمیں او . . . . . آخر بتصریح
عیسیٰ شدہ بر گنبد و بردار بر آمد . . . . . تسبیح کناں شد

عقیدہ لاینحل

الغرض لفظ ابن اللہ سے مسیحیوں کی قطعاً یہ مراد نہیں کہ مسیح عیسیٰ خدا کا جسمانی بیٹا ہے۔ البتہ قرآن مسیح کو اسی معنی میں روح اللہ کہتا ہے جس معنی میں آدمی اپنے بیٹے کو جانِ پدر کہتا ہے لہٰذا ہم اپنے اس دعویٰ کے ثبوت

میں قرآن کی صرف دو آیتیں نقل کر دیتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ اس بحث میں ہمارا اور اہل قرآن کے درمیان بہت کچھ تصفیہ ہو جائیگا۔ پہلی آیت یہ ہے انما المسیح عیسیٰ ابن مریم رسول اللہ وکلمتہ القاھا الی مریم وروح منہ یعنی تحقیق مسیح عیسیٰ ابن مریم اللہ کا رسول ہے اور اللہ کا کلمہ ہے جو ڈال دیا مریم کی طرف اور اللہ کی روح ہے (نساء ع ۲۳) دوسری بھی ملاحظہ فرمائیے ومریم ابنت عمران التی احصنت فرجھا فنفخنا فیہ من روحنا یعنی عمران کی بیٹی جس نے محافظت کی اپنی شرمگاہ کی پس پھونکا ہم نے بیچ اس کے روح اپنی کو (تحریم ۲) پہلی آیت میں خدا نے اپنا کلمہ مریم میں ڈالا اور دوسری آیت میں خدا نے اپنا روح مریم میں پھونکا۔ "ڈالنا" اور "پھونکنا" خدا کے نزدیک ایک ہی بات ہے۔ لہٰذا ہر دو آیات میں خدا فاعل ہے۔ ڈالا اور پھونکا فعل، مریم ظرف اور کلمہ و روح مظروف۔ پس اگر مسلمانوں کو کوئی امر مانع نہ ہو۔ تو وہ ہم کو کشادہ دلی سے بتائیں کہ اس سے بڑھ کر میاں بیوی میں کیا تعلق اور کیا ہوتا ہے؟

امام رازی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ کلمہ کے معنی ہیں کہ وہ پیدا کیا گیا اللہ کے کلمہ سے اور اس کے حکم سے بغیر کسی وسیلہ یا نطفہ سے (جلد سوم صفحہ ۵۰۲) اور بیضاوی لکھا ہے کلمۃ القاھا یعنے اس میں (مریم) داخل کیا گیا۔ اور اس میں ڈالا گیا۔ نہ کسی وسیلہ سے جس کے ذریعہ تخم قرار پکڑتا ہے اور نہ اس مادہ سے (جلد اول صفحہ ۲۱۹)

ہم جانتے ہیں کہ جو چیز آدمی ڈالتا ہے اس کو نطفہ کہتے ہیں اور جو خدا نے ڈالا اس کا نام کلمہ اور روح ہے۔ یہ صرف نام کا فرق ہے نتیجہ ایک ہی ہے یعنے بچہ پیدا ہوا۔ امام بیضاوی کا یہ فرمانا کہ نہ کسی وسیلہ سے جس کے ذریعہ تخم قرار پکڑتا ہے اور نہ مادہ سے تو بندہ نوازا! تخم موجود ہے یعنی کلمہ اور روح۔ مادہ بھی موجود ہے یعنی مریم۔ لہٰذا تخم نے قرار پکڑا اور لڑکا پیدا ہوا۔ اب اور کونسے ذریعے اور وسیلے کی ضرورت باقی رہ

جاتی ہے اور اگر نہ کوئی ذریعہ ہے نہ وسیلہ ہے نہ تخم ہے اور نہ مادہ ہے تو بچہ کیسے پیدا ہوا۔

انجیل مقدس ہمیں بتاتی ہے کہ کلمۃ اللہ اقنوم ثانی ہونے کے لحاظ ابن اللہ ہے کیونکہ وہ خدا سے نکلا ہے اور مجسم ہونے کے لحاظ سے ابن مریم ہے مگر قرآن شریف مسیح کو اسی معنی میں خدا کا بیٹا مانتا ہے جس معنی میں آدمی اپنے باپ کا بیٹا ہوتا ہے کیونکہ بقول قرآن خدا تعالیٰ نے وہ سب وسائل اختیار کرتا ہے جو آدمی اپنی اولاد کے لئے اختیار کرتا ہے تاہم مسلمان قبول کرنا نہیں چاہتے کہ بی بی مریم اس معنی میں خدا کی صاحبہ ہے جس معنی میں آدمی اپنی بیوی کو اہلیہ کہتا ہے۔ تعجب ہے کہ ایک غیرت مند جذبہ مسلمان کس شوخی اور عیاری سے اہل کتاب سے سوال کرتا ہے کہ خدا کے جورو نہیں۔ اس کے بیٹا کہاں سے پیدا ہوا۔ نہیں جانتا کہ قرآن اس کو کیا جواب دیتا ہے۔ ہم پوچھتے ہیں کہ خدا کی جورو کیوں نہیں؟ اس کا سبب یہ بتایا گیا ہے کہ **وانہ تعالیٰ جد ربنا ما اتخذ صاحبۃ ولا ولدا** یعنی بہت بلند ہے بزرگی ہمارے رب کی نہیں رکھی اس نے بی بی اور نہ اولاد (جن ۱-۲) گویا کہ ذاتی فخر بلند مرتبہ عزت و وقار جورو کا مانع رہا۔

قول البشر

آیت مذکورہ سے ظاہر ہے کہ بیان کرنے والا غیر خدا ہے جو خدا کو واحد مذکر سمجھتا ہے اور عام دستور کے موافق حکم لگاتا ہے کہ بغیر جورو کے بیٹا ہونا محال ہے یعنے خدا کبھی اولاد رہتا صرف جورو کی عدم موجودگی ہے ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ خدا اولاد سے محروم رہتا۔ حالانکہ خدا کی نسبت ایسا گمان کرنا ایک ادنیٰ خیال ہے کیونکہ جہاں امکان شے نہیں وہاں امکان تشبہ بھی نہیں ہو سکتا۔ کوئی نہیں کہتا کہ خدا نہیں دیکھتا کیونکہ اس کی آنکھ نہیں اور نہیں سنتا کہ اس کے کان نہیں اس لئے کہ آنکھ کان وغیرہ رفع محتاجی کے آلات ہیں۔ اور حیوانی زندگی کے لازمہ جز ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ مستغنی بالذات ہے جو بغیر آنکھ کے دیکھتا اور بغیر کان کے سنتا

اور بغیر جورو کے بیٹا بھی رکھتا ہے پس یہ محال پیش کرنا کہ خدا کی جورو نہیں تو بیٹا کیسے پیدا ہوا؟ شبہ پیدا کرتا ہے کہ اگر خدا کی جورو ہوتی وہ ضرور صاحب اولاد ہوتا حالانکہ خدا کی ذات میں جورو کا امکان نہیں۔

ان وجوہات پر اہل عرب نے قرآن کو "قول البشر" کہہ دیا "**بل قالوا اضغاث احلام بل افتراہ بل ہو شاعر**" یعنی وہ کہتے ہیں کہ قرآن پریشان خوابوں کا مجموعہ ہے۔ بلکہ اس نے جھوٹ باندھا ہے۔ بلکہ وہ شاعر ہے (انبیاء) اس پر آنحضرت نے بڑے درد سے شکایت کی **وقال الرسول یا رب ان قومی اتخذوا ہذا القرآن مہجورا** یعنے کہا رسول نے اے میرے رب میری قوم نے ٹھہرایا اس قرآن کو جھک جھک (فرقان ع۳)

فوق البشر

لیکن اگر قرآن نے بلا واسطہ پیدائش کے سبب حضور مسیح کو ابن مریم کہا ہے تو یہ خیالہ کا دروہ دلالت کرتا ہے کہ فوق البشر ہے اور بنی آدم کے سلسلے سے نہیں چنانچہ انسان کی پیدائش کے سلسلہ میں آدم پہلی کڑی ہے لیکن وہ حضور مسیح کا سلسلہ اور کڑی نہیں۔ کیونکہ وہ بذات خود اکیلا ہی ایک سلسلہ ہے (یوحنا ۱:۳) البتہ "انسانی شکل" میں ظاہر ہو کر "ابن مریم" کہلایا لیکن اس کی ابنیت (الوہیت) غیر مخلوق ہے جیسا یسعیاہ نبی کے صحیفے سے آشکارا ہے کہ "ہمارے لئے ایک لڑکا تولد ہوا اور ہم کو ایک بیٹا بخشا گیا اور سلطنت اس کے کاندھے پر ہوگی۔ اور وہ اس نام سے کہلاتا ہے عجیب، مشیر، خدائے قادر، ابدیت کا باپ، سلامتی کا شہزادہ۔"

آیت شریفہ میں کہا گیا ہے کہ لڑکا تولد ہوا یعنے موعود کی بشریت تو مخلوق ہے لیکن اس کی ابنیت (الوہیت) غیر مخلوق ہے۔ اسلئے بیٹے کے متعلق "تولد ہوا" نہیں بلکہ "بخشا گیا" لکھا ہے۔ کیونکہ وہ ازل سے تھا۔ البتہ لڑکا تولد ہوا

جس کی پیدائش کا سبب کوئی انسان نہیں (لوقا ۱: ۳۵) اور یہ مولودِ مقدس حکمت اور قد و قامت میں یعنی انسان بن کر انسان کی طرح بڑھا۔ اور خدا اور انسان کی مقبولیت میں ترقی کرتا گیا (لوقا ۲: ۵۲) حالانکہ اس کا نام خدائے قادر ہے۔ (یسعیاہ ۹: ۶)

یہ مسلّم امر ہے کہ انسان کی پیدائش بغیر کسی انسانی واسطے کے نہیں ہوتی لیکن حضور مسیح کی پیدائش کا ایسا حال نہیں بلکہ اُس کی پیدائش اختیاری ہے۔ اُس کو اختیار تھا کہ بشر بنتا یا نہ بنتا۔ (فلپیوں ۲: ۷) میں مرقوم ہے کہ اُس نے خادم کی صورت اختیار کی" یعنی اُس کو اختیار تھا کہ اپنی مرضی سے ایک حالت سے دوسری حالت میں آئے یا نہ آئے۔ لیکن چونکہ اس نے بشریت کا جامہ پہنا اس سبب سے وہ انسان کی فانی نسل سے بھی تعلق رکھتا ہے۔ پس خدا کی حکمت کا دوہرا تعلق حضور مسیح کے ساتھ ہے یعنی ازلی حیثیت ابن خدا اور اضافی حیثیت ابن مریم اور ابن مریم کا نام حضور مسیح کی الٰہی اور انسانی ماہیت کا حامل ہے یعنے اتحادی حیثیت کو ظاہر کرتا ہے۔

الحاصل خدا نے آدم کو خلق کیا۔ اور انسانی نسل کا سبب ٹھہرایا لیکن ابن خدا جنا گیا۔ اور لفظ جنا اس امر پہ دلالت صریح ہے کہ ابن غیر مولود اور واجب بالذات ہے اُس کی پیدائش کی کوئی علت نہیں۔ بلکہ وہ تنہا ذاتِ باطن کی حیثیت ظاہر ہے۔ آدم پر بہر مطلب حضور مسیح بلا واسطہ پیدائش کے سبب جیسے ابن خدا ہیں۔ (لوقا ۱: ۳۶) ویسے ابن مریم بھی ہیں ایک پہلو سے ابن خدا در اصل خدا باپ کے ساتھ ایک ہی ماہیت رکھتا ہے اور دوسرے پہلو سے وہ بشر ہے کیونکہ وہ مجسم ہو کر ابن مریم کہلایا۔ یہ الفاظ دیگر کلمۃ اللہ کی دو حیثیتیں ہیں حیثیت اول الوہیت اور حیثیت دوم بشریت اور بشری

حیثیت کو خواہ ابن مریم کہیئے یا ابن آدم بات ایک ہی ہے وہ ہر حالت میں غیر مولود اور واجب بالذات ہے۔

ابن آدم

چنانچہ ربنا المسیح نے ابن آدم کا لقب بھی اپنے لیے استعمال فرمایا لیکن اس خطاب سے آپ کے اس مشن کا پتہ چلتا ہے جس کے لئے آپ نے "انسانی شکل" میں ظاہر ہو کر "صلیبی موت" گوارا کی تھی اور یہ موت کسی بیرونی دباؤ کی وجہ سے واقع نہ ہوئی تھی۔ بلکہ انسان کی بے بسی اور روحانی کشمکش دیکھ کر حضور مسیح کے اندر تحریک پیدا ہوئی کہ وہ صلیبی موت کا مزہ چکھے۔ جس طرح کسی جلتے ہوئے گھر میں سے بچے کی طرف ہماری توجہ مبذول ہو جاتی ہے اور ہم اُس کی مدد کے لیے دوڑتے ہیں۔ اس سے کہیں زیادہ وجہ اُس پہ محبت اور پاک ابن خدا نے نوع انسان کے لیے شرم اور پچھتاوا سہا۔ اُس کے دل پہ ہمارے گناہوں کا جو بوجھ تھا اُس سے اُس کی وہ حالت سمجھ میں آتی ہے جبکہ وہ یروشلیم کو دیکھ کر رو پڑا لہٰذا ربنا المسیح کی موت میں کوئی ایسی بات نہ تھی جس کے لئے وہ پہلے سے تیار نہ ہو۔ خود اُس نے اپنی رضامندی اور خوشنودی سے ان ساری باتوں کو اختیار کیا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اُس کی موت ہی کے ذریعے خدا اور انسان میں ملاپ ہو سکتا ہے اور وقت مقررہ پہ اُس نے وفادار ضامن کی طرح اپنا قول پورا کیا اور کلوری پہ ہمارے گناہوں کے لئے اپنی جان دے دی پس حضور مسیح اس لقب سے اوّل اپنے مجسم کا اظہار فرماتے ہیں اور ثانیاً اپنے متعلق اُس کو ایک تخصیصی معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ یوں کہیں کہ ربنا المسیح نے ایک معنوی لفظت اپنی یعنی زندگی، صلیبی موت۔ فتحیاب قیامت اور ظفریاب آمد ثانی کا خلاصہ فرما کر اُسے ایک اعلیٰ ترین خطاب بنا دیا۔ اگرچہ آپ کا رتبہ اس قدر

بلند و بالا ہے کہ کوئی خطاب کما حقہٗ آپ کی ارفع ہستی کو ظاہر نہیں کر سکتا۔ تاہم ان خطابات سے جو اناجیل اور قرآن میں مرقوم ہیں ہم کلمۃ اللہ کی لاانتہائیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ما عرفناک حق معرفتک
تیری شان کے لائق ہم تجھے پہچان نہ سکے۔

منقول شرعی

یہاں تک ہم نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ہم ربنا المسیح کو ان معنوں میں ابن خدا سمجھتے ہیں جن معنوں میں وہ خدا کی شان کے شایاں ہے بیوی کے ذریعہ پیدا ہونے والے کو ہم ابن خدا نہیں کہتے ہم حق تعالیٰ کے قول و فعل سے وہی امید نہیں رکھتے جو آدمی کے قول و فعل سے ہوتی ہے۔ جیسا کہ خدا کو سمیع و بصیر کان اور آنکھ کی وجہ سے نہیں سمجھتے بلکہ بغیر آنکھوں اور کانوں کے تصور کرتے ہیں۔ ویسے ہی خدا کی ابوہیت بغیر زن و شوہری تعلقات کے مانتے ہیں پس حضور مسیح کا ابن اللہ ہونا اس معنی میں نہیں ہے جس معنی میں ہم اپنے صلبی بچے کو ابن کہتے ہیں۔ بلکہ اس لقب کو ہم ربنا المسیح کے اس ازلی و ذاتی تعلق کو جو وہ ذات واجب سے رکھتا ہے ظاہر کرنے کے لئے تمثیلی طور پہ استعمال کرتے ہیں نہ کہ حقیقی طور پر لیکن چونکہ کلمۃ اللہ کا ظہور ذات واجب سے ہے اس لئے ذات واجب کی حیثیت باطن کو "باپ" (ھو اللہ باطن) اور حیثیت ظاہر کو ابن (ھو اللہ ظاھر) کہتے ہیں۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ ابن کا لفظ منقول شرعی ہے اور بقول شخصے

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

مسیح کلمۃ اللہ

ازل سے کلمہ تھا

انجیل مقدس میں یسوع مسیح کو کلمہ کہا ہے اور اس لقب کو قرآن نے بلا کم و کاست قبول کر لیا۔ لہٰذا قرآن میں انجیلی اصطلاح کو جگہ دینا گویا اس کے مفہوم کی پوری تصدیق کرنا ہے اگر قرآن کو انجیل کے معنوں میں ذرا بھی اختلاف ہوتا تو وہ اس لقب کو بالکل ترک کر دیتا جیسے ابن اللہ کہنے کی بجائے "روح اللہ" کہا لیکن برخلاف اس کے کلمۃ اللہ کے لقب کو بلا قیل و قال قبول کر کے انجیل کے بیان کی تصدیق کی پس جب قرآن نے کلمۃ اللہ کی اصطلاح کو بغیر کسی تشریح کے قبول کر لیا تو اب بجز یہ ماننے چارہ نہیں کہ مسیح تجسم سے پہلے بحیثیت کلمہ خدا کی ذات میں مثل عقل اور ذہن کے موجود تھا اور اس کا تعلق ذات الٰہی کو ظاہر کرتا رہا گویا کلمۃ اللہ خدا کی ذات سے ایسا ہی تعلق رکھتا ہے جیسے کہ انسانی عقل انسان کی ذات سے علاقہ رکھتی ہے۔ پس کلمہ کیا ہے؟ وہ ایک شے ہے جو متکلم کی ذات میں قائم ہے کلمہ متکلم کی عقل و حکمت اور اس کی روح کا اظہار ہے انسان کے ضمیر کا بیان صرف کلمہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ اگر انسان کلام نہ کرے تو اس کے خیالات دوسروں پر مخفی رہ جائیں گے۔ اسی لئے کہا گیا ہے:۔

تا مرد سخن نگفتہ باشد   عیب و ہنرش نہفتہ باشد

چنانچہ کتب الہامی کو اسی بنا پر خدا کا کلام کہا گیا ہے کہ ان کے ذریعہ خدا کی مرضی بھی آدم پر ظاہر ہوئی اور معلوم ہوا کہ وہ کیا چاہتا ہے اور کیا نہیں چاہتا۔ یوں تو یہ معنی میں سارا عالم خدا کا کلام ہے کیونکہ اس سے ہم پر خدا کی قدرت اور حکمت مترشح ہوتی

ہوتی مگر یہ انکشاف تام نہیں۔ اِس لئے عالم کو کلمۃ اللہ کا نام نہیں دیا گیا جیسے ہر شخص خُدا کا بھیجا ہُوا اور اُس کا نائب ہے مگر ہر شخص رسُول اللہ نہیں۔ اِسی طرح بجز حضور مسیح کے کوئی اور شخص کلمۃ اللہ نہیں کہلا سکتا۔ غرضکہ خُدا نے ہمیں اپنی کتابیں بخشیں اور اُن کو اپنا کلام فرمایا۔ مگر خُدا تو ایک مشخص وجود ہے لہٰذا کوئی الہامی کتاب بھی اُس کی کامل شخصیت کو پُورے طور پر ظاہر کرنے سے قاصر رہے گی۔ اِس لئے خُدا نے اپنی بڑی رحمت سے اپنی حکمت و قدرت اور مرضی کا اظہار ایک شخص کے ذریعے کیا جو انسانی شکل میں انسانوں کے درمیان رہا۔ وہ گویا بندوں کے درمیان "خُدا کا خیمہ" تھا جس میں خُدا اپنے بندوں کے ساتھ بُودوباش کرنے لگا۔ حالانکہ کلمہ پیدائش عالم کا باعث بنا۔ وُہی نبیوں کے ذریعے کتاب اور الفاظ بنا اور اب وُہی جسم میں ظاہر ہُوا۔ انسان بنا۔ پس کلمۂ خُدا کیا ہے؟ خُدا کی ذات کا مظہر جس کی معرفت ہم خُدا کو جان سکتے ہیں اور جب مسیح کو کلمۃ اللہ کہا گیا تو ہم خُدا کی قدرت و حکمت، تقدس و رحم اور عدل و انصاف کو اس میں دیکھ سکتے ہیں کیونکہ وہ خُدا کا مظہر ہے چونکہ کلام متکلم کے خیالات کا آئینہ ہوتا ہے پس مسیح کلمۃ اللہ خُدا کا آئینہ ہے جس میں دیدارِ الٰہی ہوتا ہے "جس نے مجھے دیکھا اُس نے باپ کو دیکھا۔" (یُوحنا ۱۴: ۹)

کلمہ قائم بالذات تھا

یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ لفظ لوگوس یعنی کلمہ یُونانیوں سے یہودیوں میں رائج ہُوا اور فائلو نے اسے خاص طور پر اپنی تحریر میں جگہ دی۔ چنانچہ حکیم ارسطا طالیس نے کلمہ کے دو مفہوم بتائے یعنی کلمہ باطن اور کلمہ ظاہر۔ کلمہ باطن سے مراد عقل ہے اور کلمہ ظاہر سے قوّتِ نطق بالفاظ دیگر کلام کے دو مفہوم ہیں۔ یعنی کلمہ نفسی اور کلام لفظی اور وہ کلام جو خُدا کی ذات میں مثل عقل اور ذہن کے موجود تھا۔ اسے کلام نفسی کہہ سکتے ہیں

اور خُدا کا وہ کلام جو مثلِ نطق ذاتِ الٰہی کو ظاہر کرتا رہا۔ اِسے کلام لفظی کہہ سکتے ہیں یعنے وہ کلام جو نبیوں کی معرفت ہم تک پہنچا اور انسانی الفاظ و محاورات اور اصوات میں غیر محدود خُدا کا مثالی بیان ہے۔ اور کلام لفظی اِس کے لئے ظرف کے طور پر ہے اور چونکہ کلام لفظی مادی اور فانی ہونے کے باوجود کلام نفسی کا مظہر اور ظرف ٹھہرا ویسے خُدا بھی انسان کے فائدے کے لئے الہامی کلام کی طرح محدود اور دیدنی جسم میں ظاہر ہُوا۔ پس کلمہ سے مراد کسی زبان کا لفظ نہیں بلکہ یہ لقب ابن اللہ کا ہے۔ لیکن وہ اِس لئے کلمہ کہلاتا ہے کہ اُس نے خُدا کو ظاہر کیا۔ جیسے کوئی محاورہ کسی خاص مطلب کو دکھاتا ہے ویسے کلمہ نے الوہیت کی ساری شان اپنے تجسم سے ظاہر کی۔

کلمہ عین خدا تھا

دنیا میں ہر ایک جلیل القدر شخص کی سوانح عمری اُس کے روزِ تولد سے شروع ہوتی ہے لیکن قبل اِس کے کہ کائنات ظہور میں آئے ازل سے کلمہ تھا اور یہ کلمہ جو قائم بالذات تھا۔ عین خُدا تھا۔ کیونکہ "ساری چیزیں اُسی کے وسیلے سے پیدا ہوئیں" اور کہ "اُس میں زندگی تھی اور وہ زندگی آدمیوں کا نور تھا اور نور تاریکی میں چمکتا ہے مگر تاریکی نے اُسے قبول نہ کیا۔" حالانکہ جہالت کی تاریکی روشنی کی آمد پر کافور ہو جاتی ہے۔ مگر اخلاقی "تاریکی" روشنی کا مقابلہ کرتی ہے جس طرح صبح کے وقت سورج کے طلوع پر رات کی تاریکی موقوف ہو جاتی ہے اور سورج کی روشنی زمین پر پھیلنے لگتی ہے مگر گھر جس کے اندر کثافت اور دھواں بھرا ہوتا ہے آسمان پر سورج کی روشنی کو چھپا لیتی ہے اسی طرح اخلاقی "تاریکی" کا حال ہے۔ الغرض جس کلام کے وسیلے سے عالم پیدا ہوئے وہ کسی زبان کا لفظ نہ تھا کیونکہ لفظ بذاتِ خود حادث ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ حادث کسی محدثات کا باعث نہیں ہو سکتا۔ پس وہ "کلمہ عین خُدا تھا"۔

شانِ اُلوہیت

علاوہ ازیں کلمۃ اللہ نے اپنے لاثانی اختیارِ زندگی، موت اور مُردوں میں سے تیسرے روز جی اُٹھنے کے ذریعے ظاہر کیا کہ آپ انسانی جامے میں خُدائے قادر ہیں جیسے انبیاء نے اپنے معجزوں سے اپنی نبوت اور رسالت ثابت کی۔ چنانچہ ربنا المسیح نے جس اختیار کا دعوےٰ کیا انبیاء میں سے کوئی بھی اس قسم کے دعوے کا مدعی نہیں ہُوا۔ اور جس اختیار کے ساتھ آپ لوگوں کو تعلیم دیتے تھے اور جس اقتدار کے ساتھ آپ معجزے کرتے تھے تمام پیغمبروں میں آپ کی یہ امتیازی خصوصیت ہے۔ انبیاء خُدا تعالیٰ کے نام سے الٰہی پیغام کا آغاز کرتے تھے لیکن اس کے برعکس آپ اپنے نام و اختیار سے کلام فرماتے تھے چنانچہ آپ توریت کے احکام کا حوالہ دیتے ہُوئے فرماتے ہیں کہ "تم سُن چکے ہو کہ اگلوں سے کہا گیا تھا خون نہ کرنا۔ مگر میں تم سے کہتا ہوں ....." اور یہ جملہ "میں تم سے کہتا ہوں" آپ کے اختیار پر دلالت کرتا ہے جو کسی اور نبی کو حاصل نہیں تھا۔ اسی طرح جو معجزے پیغمبروں نے دکھائے وہ اُن کی ذات سے تعلق نہیں رکھتے تھے مثلاً حضرت موسیٰ نے خُدا کے حکم کے مطابق زمین پر لاٹھی پھینکی اور وہ سانپ بن گیا۔ جس سے موسیٰ خوف زدہ ہو کر بھاگے۔ اگر آنحضرت قادر ہوتے تو بھاگتے کیوں؟ اور آنحضرت جانتے بھی نہ تھے کہ لاٹھی پھینکنے سے کیا ہوگا۔ لیکن ربنا المسیح کے معجزات آپ کی اُلوہیت پر دلالت کرتے ہیں۔ کیونکہ جس طرح باپ مُردوں کو اُٹھاتا اور زندہ کرتا ہے۔ اسی طرح بیٹا بھی جنہیں چاہتا ہے زندہ کرتا ہے (انجیل شریف یوحنا ۵: ۲۱) مُردوں کو زندہ کرنا صرف خُدا کا کام ہے هُوَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ اللہ ہی جلاتا ہے اور مارتا ہے (سورہ مومن رکوع ۷) لیکن خُداوند تعالیٰ کی اس خاص صفت سے ربنا المسیح متصف ہیں اور آپ کی الٰہی قدرت کو دیکھ کر بے اختیار کہنا پڑتا ہے کہ:

ذاتِ او در شکلِ مجسم آمد

کلمۃ اللہ مجسم ہُوا

مختصر یہ کہ کلمہ بصورت ابنِ مریم دُنیا میں تشریف لائے لیکن آپ کے وجود کی ابتدا بنی آدم کی طرح بطنِ مادر میں نہیں ہُوئی۔ بلکہ آپ اس سے پہلے موجود تھے۔ اور ایک مستقل ہستی رکھتے تھے۔ حتیٰ کہ شکمِ مادر میں آنے کے قبل بھی آپ کلمہ کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ ملائکہ نے آپ کا ذکر اسی نام سے زکریا نبی سے کیا اور خبر دی کہ "یحییٰ مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللَّهِ" یعنی یحییٰ اللہ کے کلمہ (مسیح) کے تصدیق کرنے والے ہوں گے۔ اب وہی کلمہ دُنیا میں آیا اور انسانی صورت اختیار کی۔ اور کسی نامعلوم طریقہ سے مریم صدیقہ کی طرف منتقل ہُوا اور اس حقیقت کو قرآن نے "اَلْقٰهَا اِلٰی مَرْیَمَ" سے تعبیر کیا۔ مریم صدیقہ کی طرف کلمہ کا آنا بجز اس کے اور کوئی معنی نہیں رکھتا کہ کلمہ مریم کے بطنِ اطہر میں آیا مجسم ہُوا۔ انسان بنا جو پہلے کلمہ تھا اب دُنیا میں ابنِ مریم کے نام سے مشہور ہُوا۔ یعنی مسیح عیسیٰ ابنِ مریم۔

عارضی ظہور

توریت شریف میں مرقوم ہے کہ خُدا کا عجیب ظہور بدلی میں ہُوا جو قرآن میں سکینت یعنی تسلی سے تعبیر کیا گیا ہے (سورۃ بقرہ ۲ع) اور آنحضرت محمد صلعم اور حضرت ابوبکر پر بھی نازل ہُوا جبکہ وہ مکہ سے ہجرت فرما کر غارِ ثور میں چھپے تھے (سورۃ توبہ ۳۹)
حضرت موسیٰ کی کتاب خروج ۳: ۲ تا ۵ میں خُدا کے عارضی ظہور کا بیان ملتا ہے جبکہ ایک بوٹا شعلہ زن تھا مگر وہ جل نہیں جاتا تھا چنانچہ آنحضرت موسیٰ آگ سمجھ کر بوٹے کے نزدیک جاتے ہیں کہ آگ میں سے خُدا نے فرمایا کہ "اے موسیٰ میں تیرا خدا ہوں اپنے پاؤں سے جوتا اُتار کیونکہ یہ جگہ جہاں تو کھڑا ہے مقدس زمین ہے" قرآن میں اس ظہور کا ذکر یوں آیا ہے کہ جب موسیٰ آگ کے نزدیک آیا درخت سے یہ آواز آئی کہ اے موسیٰ میں ہی اللہ رب العالمین ہوں۔ اے موسیٰ اپنے پاؤں سے دونوں جوتیاں اُتار کر تو مقدس وادی میں ہے (سورۃ قصص و سورۃ طہٰ)

دائمی ظہور

الغرض زمانۂ آدم سے لیکر خُدا کا عارضی ظہور کسی نہ کسی جسمانی مظہر میں ہوتا رہا اور آخری زمانہ میں خُدا کا دائمی مظہر یسوع مسیح تھا۔ لیکن اگر خُدا کا

ظہور نا ممکن ہوتا تو ہم کسی خاص جگہ کو "بیت اللہ" یا "مقدس زمین" بھی نہ کہہ سکتے۔ کیونکہ خدا ہر جگہ حاضر و ناظر ہے کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں وہ نہ ہو لیکن ہر جگہ بیت اللہ نہیں کہلا سکتی۔ چونکہ وجود کے طور پر محیط کل، جگہ سے مختص نہیں ہو سکتا پس ظہور کے طور پر اس کا مختص بالمکان ہونا ضروری ہے لہذا اگر خدا کے دیدنی مظہر سے انکار کیا جائے تو کوئی محدود مکان نہ تو بیت اللہ کہلا سکتا ہے اور نہ ہی محدود انسان کے لئے غیر محدود ازلی ذات کی عبادت بلا واسطہ ممکن ہے۔ کیونکہ بلا واسطہ عبادت کے لئے ذاتِ واجب کا نام اور اس کا ثبوت تصور بھی غیر محدود چاہیے پس جب تک خدا تعالےٰ کا ظہور محدود اور حادث شے میں نہ مانیں محدود انسان کے لیے اس کی معرفت اس کا حقیقی تصور اور اس کی عبادت محال ہے۔

مقصدِ تجسم

خدا چونکہ مشخص ہستی ہے اس لئے وہ ہر فرد و بشر کی فکر کرتا ہے اس نے محض ایک پیغام نہیں دیا۔ کہ وہ نوعِ انسان کا دوست ہے بلکہ بطور درمیانی رو واسطہ بن کر ہمارے پاس آتا ہے جیسے سورج کے ذریعے خدا ہماری دنیا کو روشنی گرمی، زرخیزی اور دیگر بے شمار برکتیں عطا فرماتا ہے اسی طرح درمیانی کے وسیلے خدا بنی آدم کو نجات کی برکتیں بخشتا ہے۔ "خدا اپنی محبت کی خوبی ہم پر یوں ظاہر کرتا ہے۔ . . . باوجود گنہگار رہتے پھر بھی خدا سے ہمارا میل ہو گیا"۔ درحقیقت خدا کی محبت انسانی تکمیل چاہتی ہے۔ اور انسانی محبت اس کے برعکس اپنی ہی کی سیری۔ اگر مرغوب چیز ملی تو خیر ورنہ ہماری محبت کمزور ہو جاتی ہے لیکن خدا اپنی محبت سے دوسروں کو راحت بخشتا ہے ہماری کمزوریوں کو دور کرتا ہے ہمارے کمال کی غرض سے "جہاں میں ہوں وہ بھی ہوں"۔ ہم سے محبت رکھتا ہے وہ کسی کی ہلاکت نہیں چاہتا جیسے باپ اپنے بچوں سے محبت رکھتا ہے ویسے خدا بھی گنہگاروں سے محبت رکھتا ہے اسی باعث خدا کے اکلوتے بیٹے نے انسانی ذات

اختیار کی تاکہ ہمیں روحانی پیدائش حاصل ہو اور فضلِ الٰہی سے ہم خدا کے فرزند بن جائیں وہ ایک کمزور بچہ بنا تاکہ ہم کامل انسان بن جائیں اور نیک اعمال ہم سے صادر ہوں اگرچہ وہ دولتمند اور آسمانی بادشاہت کا سلطان تھا ہماری خاطر غریب بنا تاکہ ہم امیر بنیں وہ آسمان سے زمین پر آیا تاکہ ہم آسمان تک پہنچ جائیں۔ وہ جو خلقت کو خوبصورت لباس پہناتا ہے خود معمولی لباس میں رہا تاکہ ہم موت کے بعد آسمانی خلعت سے ملبّس ہوں۔ وہ جس کا مسکن آسمان ہے تنگ و تاریک اصطبل میں پیدا ہوا تاکہ وہ اپنی بادشاہت میں ہمیں رفیع مقامات عطا فرمائے۔

مطلب یہ ہے کہ خدا نے مسیح میں ہو کر اپنے ساتھ دنیا کا ملاپ کر لیا گویا خود خدا نے پاک مجسم کی تاثیر کے سبب نوعِ انسان کا ایک نیا جدِ امجد بن جاتا ہے جیسے ہم اپنی طبعی پیدائش کے باعث اپنے والدین کی گناہ آلودہ فطرتوں کو ورثہ میں حاصل کرتے ہیں ویسے ہی ہم بذریعہ ایمان بالکفارہ مسیح کی پاک اور بے گناہ انسانی ذات میں شریک ہو جاتے ہیں۔ اور یوں اس پاک ذات کی قوت کی تاثیر سے گناہ پر فتح حاصل کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ اور چونکہ ایماندار کا تعلق مسیح کے ساتھ ایسا ہی ہے جیسے اعضاء کا سر کے ساتھ یا جیسے شاخوں کا تنہ کے ساتھ ویسے مسیح کے ذریعے انسان کا خدا کے ساتھ اتحاد ہو جاتا ہے اگرچہ اس جہان میں الٰہی زندگی کا پورا ثمرہ حاصل نہیں ہوتا۔ لیکن آئندہ جہان میں جب انسانی ذات گناہ کے ہر دھبے سے پاک صاف ہو جائے گی۔ تو ہر ایک سچا ایماندار خدا کو ایسا ہی دیکھیگا۔ "جیسا کہ وہ ہے"۔

مختصر یہ کہ کلمۃ اللہ اس لئے ہماری طرح انسان بنا تاکہ وہ جیسے پیدائش عالم کا سببِ اول ہے ویسے ہی ذاتِ واجب سے اُن کے ملاپ کا بھی سبب آخر ہو۔ پس کلمۃ اللہ ہی "اول و آخر" اور وہی "ابتدا و انتہا" ہے۔

مسیح رُوح اللہ

شانِ ارفع

لہٰذا المسیح کو اعجازی پیدائش کی بنا پر قرآن شریف نے رُوح اللہ کہا ہے اور یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جو بجز کلمۃ اللہ کے کسی اور نبی کو نصیب نہیں ہوئی۔ چنانچہ شیخ اسلام ابن جوزی لکھتے ہیں ”اب دو امر باقی رہ گئے اوّل یہ کہ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ جب فرشتے نے مریم میں نفخ کیا تھا جس طرح دیگر انسانوں میں نفخ کرتا ہے تو مسیح کو رُوح اللہ کیوں کہا گیا جب تمام ارواح اسی فرشتے کے نفخ سے حادث ہوتی ہیں۔ تو مسیح کی اس میں کیا خصوصیت رہی؟ دوم یہ کہ حضرت آدم میں بھی اسی فرشتے نے رُوح پھونکی تھی یا خود خدا نے جس طرح آدم کو اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا اسی طرح اس میں رُوح بھی پھونکی تھی؟ بہ حقیقت میں یہ دونوں سوال قابل غور ہیں۔ امر اوّل کا جواب یہ ہے کہ جس رُوح کو مریم کی طرف نفخ کیا گیا یہ وہی رُوح ہے جو خدا کی طرف مضاف ہے اور جس کو خدا نے اپنے نفس کے لئے مخصوص کیا ہے اور یہ تمام ارواح میں ایک خاص رُوح ہے۔ یہ رُوح وہ فرشتہ نہیں جو خدا کی طرف سے ان کے پیٹ میں مومن اور کافر کے بچوں میں رُوح پھونکتا ہے بلکہ یہ رُوح جو مریم میں نفخ کی گئی وہ خاص رُوح ہے جس کو خدا نے اپنی ذات کے لئے مخصوص کیا ہے۔“ (کتاب الرُوح صفحہ ۲۴۷)

امام رازی کا یہ کہنا ہے کہ ”وہ مسیح اس لئے رُوح اللہ کہلاتا ہے کہ وہ اہل دُنیا کو اُن کے ادیان میں زندگی بخشنے والا ہے۔“ اسی طرح بیضاوی فرماتے ہیں کہ ”وہ اس لئے رُوح کہلاتا ہے کہ اُس میں بلا واسطہ خدا تعالیٰ کی رُوح ہے جو ذات و ماہیت میں خدا کے ساتھ ایک ہے اور اصل کے لحاظ سے بلا واسطہ خدا سے صادر ہے“ اور کہ ”وہ مُردوں کو زندہ کرتا

ہے اور بنی آدم کے دلوں میں حیات بخشتا ہے۔“

مفسر حسینی آیت زیر بحث کی یُوں تفسیر فرماتے ہیں کہ ”انما المسیح عیسیٰ ابن مریم جُز این نیست کہ مسیح عیسیٰ پسر مریم است۔ رسول اللہ فرستادہ خدا است و کلمتہ یعنی کلمۂ اوست و گفت اند مراد از کلمہ بشارتیت بوقوع ولدی بے مساس بجاری ”القاھا“ برسانید آں کلمہ را خدای ”الیٰ مریم“ بسوئے مریم یعنی بشارت داد او را و روح منہ و دیگر یعنی خداوند رُوح است صادر شدہ از حق سبحانہٗ بے توسط اسباب۔“

اس سے زیادہ تعجب انگیز اور حیرت افزا کوئی امر نہیں ہو سکتا جبکہ قرآن اور مفسرین اسلام نے یہ مانا کہ ”جو کلمہ“ اور ”روح“ شکم صدیقہ میں در آیا قائم بالذات اللہ تعالیٰ ہے اور اگر یہ درست ہے کہ رُوح اللہ نفخ کے بعد ابن مریم کہلایا تو یقیناً وہ ابن اللہ ہے کیونکہ نفخ رُوح کا محل سوا مریم صدیقہ کے اور کوئی نہیں۔ اگر وہ ظہور سے پہلے کلمۃ اللہ تھا جو صدیقہ کی طرف القا ہوا تو یہ ماننے بغیر چارہ نہیں کہ گویا خود خدا نے المسیح میں مجسم ہو کر بنی انسان میں بود و باش کی اور اہل دُنیا کے ادیان میں زندگی بخشی پھر کیوں برادران اسلام اس جانب غور نہیں کرتے؟ حالانکہ ہماری مراد ابن اللہ سے وہی ہے جو اُن کی کلمۃ اللہ اور رُوح اللہ سے ہے یعنی یہ کہ ”ابتدا میں کلمہ تھا اور کلمہ خدا کے ساتھ تھا اور کلمہ خدا تھا۔“ اور کہ ”وہ کلمہ مجسم ہوا اور فضل اور سچائی سے معمور ہو کر ہمارے درمیان رہا۔ اُس کی معموری میں سے ہم سب نے پایا یعنی فضل پر فضل۔“

الحاصل مفسرین اسلام کے نزدیک مسیح اگرچہ بحیثیت انسان اللہ کے رسول تھے لیکن مبعوث ہونے سے پہلے آپکا وجود بحیثیت ”کلمہ و روح“ تھا۔ آپ نے صرف بطن مادر میں ہی وجود نہیں پکڑا بلکہ آپ اس سے پہلے موجود تھے۔ اور کلمہ کے لقب سے پکارے جاتے تھے اسی نام سے ملائکہ نے ذکریا کو خبر دی یحییٰ مصدقا بکلمتہ من اللہ ہونگے۔ بہرحال حضور کا رسول ہونا کوئی عجوبہ ماجرا نہیں۔ ہاں اگر کوئی نادر بات تھی تو

وہ یہ تھی کہ آپ خدائے برحق کے کلمہ ہونے کے باوجود ہیکلِ انسانی میں ظاہر ہوئے۔
چونکہ آپ بہترین خلائق یعنی کلام مجسم تھے۔ اسی باعث آپ کو ابنِ مریم کے لقب سے
ملقب کیا گیا۔ اس اجمال کی تفصیل سورۂ مریم ۱۶ تا ۳۳ آیات میں موجود ہے اس
سے بڑھ کر آپ ایک ایسی بلندی پر دکھائی دیتے ہیں جس پر تمام بلندیاں ختم ہو
جاتی ہیں اور وہ آپ کے خطاب روح اللہ سے ظاہر ہوتی ہے۔

نسبتے نیست بذاتِ تو بنی آدم را — برتر از عالم و آدم تو چہ عالی نسبی

الغرض اسلام میں مسیح کی عظمت دیگر انبیاء سے نہایت ہی ارفع اور اعلیٰ نظر آتی
ہے کبھی آپ کو من المقربین کہا گیا اور کبھی آیت اللہ اور کبھی آپ کو کلمۃ اللہ کہہ کر تجلی الٰہی
ذات پر مہر ثبت کی اور روح اللہ کہہ کر آپ کی الوہیت کی طرف اشارہ کیا اور کبھی
وجیہا فی الدنیا والاخرۃ کے القاب سے آپ کی امتیازی خصوصیات کا
مظاہرہ کیا بھلا کوئی کہاں تک آپ کے کمالات روحانی اور مدارج علوی کا ذکر کرے
اور کہاں تک کوئی اپنے فکر کو دوڑا کر ان موتیوں کو اکٹھا کرے جو قرآن میں جابجا بکھرے
ہیں مسیح تو وہ ہے کہ

شان ارفع ہے تری مرتبہ اعلیٰ تیرا — تو ہے یکتا کوئی ثانی نہیں حقا تیرا

اعجازی ظہور

مسیح کلمۃ اللہ کی اہمیت سمجھنے کے لئے آپ کے اعجازی ظہور کا
ذکر خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ چنانچہ مرقوم ہے۔ واذ قالت الملئکۃ
یامریم ان اللہ یبشرک بکلمۃ منہ اسمہ المسیح عیسیٰ ابن مریم وجیہا
فی الدنیا والاخرۃ ومن المقربین۔ کہا فرشتے نے اے مریم خدا خوشخبری دیتا ہے تجھ
کو ساتھ ایک کلمہ کے جس کا نام عیسیٰ ابن مریم ہے وہ عزت والا ہوگا بیچ دنیا و آخرت
کے بزرگ ہوگا۔ قالت انی یکون لی ولد ولم یمسسنی بشر ـــــ مریم
نے کہا اے میرے پروردگار میرے لڑکا کیسے ہو سکتا ہے۔ حالانکہ مجھے کسی مرد

نے نہیں چھوا قال کذلک اللہ یخلق ما یشاء واذا قضی امرا فانما یقول لہ کن فیکون
کہا یہی ہوگا اللہ پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے جب وہ کسی کام کا کرنا ٹھہرا لیتا ہے تو
کہہ دیتا ہے ہو جا اور وہ کام ہو جاتا ہے (آل عمران)

گنہگاروں سے جدا

اب ذرا الٰہی انتظام دیکھیے اس نے اپنے کلمہ کا لباس
بنانے سے پہلے کتنا بڑا اہتمام کیا کس طرح مریم صدیقہ
بطن مادر ہی سے خدا کے نذر ہو چکی تھیں۔ قالت امرات عمران رب انی نذرت
لک ما فی بطنی محررا فتقبل منی یعنے عمران کی عورت نے کہا کہ میرے رب جو کچھ
میرے پیٹ میں ہے میں نے تیری نذر کیا تو اسے میری طرف سے قبول کر چنانچہ
جب صدیقہ پیدا ہوئیں تو آپ کی والدہ ماجدہ نے خدا کے حفظ و امان میں سونپ
دیا وانی اعیذھا بک وذریتھا من الشیطان الرجیم کہ میں اس
کو اور اس کی اولاد کو شیطان مردود سے تیری پناہ میں دیتا ہوں (عمران ۳۲ و ۳۳)
چونکہ یہ دعا قبول ہو چکی تھی۔ اس لیے شیطان کی کیا مجال تھی کہ صدیقہ کے پاس
پھٹک جائے یہی وجہ ہے کہ مریم اور ابنِ مریم دونوں مس شیطانی سے محفوظ رہے
حالانکہ انسانی پیدائش کا عالمگیر قانون یہ ہے کہ ہر بچہ خواہ وہ ولی ہو یا رسول ہو۔
یا نبی۔ بطن مادر سے نکلتے وقت مس شیطانی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اور اس کی پہلی
چیخ مس شیطانی کے باعث ہوا کرتی ہے۔ مگر سوائے مسیح اور صدیقہ کے کوئی اور
مس شیطانی سے محفوظ نہ رہا۔ ما من مولود یولد الا والشیطان یمسہ حین
یولد فیستہل صارخا من مس الشیطان ایاہ الا مریم وابنہا (مشارق الانوار
حدیث نمبر ۹۲۹)

اس کے سوا صدیقہ کی نشوونما خدا کے گھر مسجد الاقصیٰ الذی برکنا حولہ
میں ہوئی اور آپ کی تعلیم و تربیت پر ذکریا نبی مامور کئے گئے وکفلہا ذکریا۔ ذکریا کو

اس کا کفیل بنایا (عمران) آسمانی خوراک رزقاً من عند اللہ سے آپ کی پرورش کی گئی (مائدہ) بھلا جس کی طرف پیغام وحی ملائک لاتے ہوں یٰمریم ان اللہ اصطفٰک اے مریم تجھے پسند کیا اللہ نے وطھرک تجھے پاک کیا واصطفٰک علیٰ نساء العٰلمین اور سارے جہان کی عورتوں پر تجھے برگزیدہ کیا۔ (عمران ۳۷) اور جس کا بطن ہر لوث سے منزّہ ہو چکا تھا کس طرح ممکن تھا کہ شیطان کی پہنچ اس تک ہو سکے۔ اور ہو بھی کیسے سکتی تھی جبکہ خدا نے فتقبلها ربها بقبول حسن اپنی مقبولیت میں لے لیا (عمران) اور یوں اس جیسی بگاڑ کو مریم صدیقہ میں معدوم کر دیا یعنی خطاء آدم مخطات ذریتہ آدم نے خطا کی اور اس سبب سے اس کی اولاد بھی گنہگار ہوئی۔

اب وہ بطن جو ہر لوث سے منزہ ہو چکا تھا۔ خدا نے کسی نامعلوم روحانی عمل سے اپنے کلمہ کا جسمانی لباس پہنایا بھلا کس طرح خدائے غیور کو پسند آتا کہ وہ اپنے مولود کے حق میں باپ کی نسبت سوائے اپنی قدوس ذات کے کسی اور طرف منسوب ہونے دیتا اس اجمال کی تفصیل انجیل مقدس میں یوں ہے کہ فرشتے نے صدیقہ سے کہا کہ روح القدس تجھ پر نازل ہوگا اور حق تعالےٰ کی قدرت تجھ پر سایہ ڈالیگی اس سبب سے وہ پاکیزہ جو پیدا ہونے والا ہے خدا کا بیٹا کہلائیگا۔ (لوقا ۱: ۳۵)

انکشاف حقیقت

لگے ہاتھ ہم مرحوم اکبر مسیح کے الفاظ میں ناظرین پر یہ راز بھی سمجھائے دیتے ہیں کہ کیوں قرآن شریف نے ابن اللہ کا پاکیزہ خطاب ترک کیا اور اس کی بجائے کیوں ہم معنی ایک دوسری اصطلاح کو رواج دیا ہم کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عرب کے لوگوں کے خیالات اس زمانے میں کچھ ایسے بگڑے ہوئے تھے اور انہوں نے اس پاک اصطلاح کو کسی ناپاک معنی میں رکھ لیا تھا جس کی وجہ سے آنحضرت محمد صلعم نے اس مبارک لقب کو ترک کیا اور اس کی بجا ہم معنی الفاظ کو رواج دیا جن کا استعمال ان لوگوں کے لئے محمد صلعم کو کم خطرناک

معلوم ہوا مثلاً عیسائی خداوند مسیح کو خدا کا بیٹا بھی کہتے ہیں اور خدا کا کلمہ بھی قرآن نے دوسری اصطلاح کو بحال رکھا اور پہلی کی بجائے اس کے ہم معنی ایک دوسری اصطلاح کو رواج دیا۔ یعنی روح اللہ جس کے معنی خدا کی جان ہے بیٹے کے لئے بہت سے استعارات رائج ہیں۔ اس کو قرۃ العین بھی کہتے ہیں اور جان پدر بھی کہتے ہیں۔ اسی جان پدر کی اصطلاح قرآن نے اختیار کر لی اور بجائے بیٹے کے خداوند مسیح کو خدا کی روح کہا۔ چونکہ عرب کے درمیان بہت سے فاسد خیال رائج تھے مثلاً وہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے۔ اور یونانیوں کی طرح دیوتاؤں کو خدا کے بیٹے مانتے تھے۔ اور لفظ بیٹے بیٹیاں اصطلاحی معنوں میں نہیں بلکہ محض عرفی معنوں میں سمجھتے تھے۔ یونانیوں کے تمام دیوتا انسانی خاندان کی طرح بیوی بچے والے تھے۔ یہی حال عرب کا تھا۔ یہی حال ہندوؤں کا ہے۔ اگر رام ہے سیتا بھی ہے اگر کرشن ہے تو رادھا بھی ہے۔ اگر مہادیو ہے تو پاربتی بھی ہے اب سمجھدار اچھنبا کی بات ہے۔ مصلحین نے اپنی مصلحت کو خوب پہچانا۔ آنحضرت نے یہ مناسب سمجھا کہ اس وقت ابن اللہ کی اصطلاح کو ترک کر دیا جائے۔ مبادا اس اصطلاح سے جو کفر و شرک کے نازیبا خیالات مل گئے ہیں۔ ان سے یہ نادان بت پرست کہیں دھوکا نہ کھائیں۔

لفظی نزاع

یہی وہ مصلحت جس کے باعث آنحضرت محمد صلعم نے ابن اللہ کی پاک اصطلاح کو لفظ روح اللہ کا لباس پہنایا ورنہ لفظ ابن اللہ کے ترک کرنے کی کوئی وجہ ہمیں معلوم نہیں ہوتی۔ جبکہ قرآن نے مسیح کو ایسے جلالی القاب سے ملقب کیا ہے جس کی نظیر تاریخ مذہب پیش نہیں کر سکتی۔ غرضیکہ مسیحیوں اور مسلمانوں کے درمیان صرف لفظی نزاع ہے اس کے معنی پر کوئی اعتراض نہیں۔ ابن اللہ کے وہی معنی ہیں جو روح اللہ کے ہیں۔ ذات باری تعالیٰ کے ساتھ

جو ابن اللہ کا بے عدیل تعلق ہے اس کے اظہار کرنے میں انسانی زبان تو قاصر ہے
چاہے اسے روح اللہ کہو یا ابن اللہ کہو بات ایک ہی ہے وہ ہر حالت میں "کلام خدا"
ہے جو مریم کی طرف القا کیا گیا۔ یعنے حق تعالے نے اپنے کلمہ کو مریم صدیقہ کے بطنِ
مطہر میں کسی روحانی عمل سے پہنچا کر اُسے انسانی لباس پہنایا۔ "ابتدا میں کلمہ
تھا اور کلمہ خدا کے ساتھ تھا۔ اور کلمہ خدا تھا۔" اور "کلمہ مجسم ہوا اور فضل اور
سچائی سے معمور ہو کر ہمارے درمیان رہا۔ اور ہم نے اُس کی معموری میں سے
سب نے پایا یعنی فضل پر فضل"۔

آسمانوں سے بلند

کہاں تک ہم المسیح کی عظمت اور خصوصیات کا تذکرہ کریں قلم
کو یارا کہ بیان نہیں جو الٰہی کمالات یسوع مسیح میں جلوا
پائے وہ بے مثل ہیں۔ تو ہی ایک ہے جو گنہگاروں سے جدا اور آسمانوں سے
بلند ہے۔ آپ روح اللہ ہو کر بطنِ صدیقہ میں تشریف لائے۔ کلمۃ اللہ ہو کر زمین
پر جلوہ پُرنور فرمایا۔ آغوشِ صدیقہ میں آتے ہی نبوت کا ڈنکا بجایا۔ "تکلم فی المہد"
آپ کا معجزہ نبوت تھا جس طرح آپ کا اعجازی ظہور ہوا ایسے ہی آپ کی
جلالی زندگی تھی۔ آپ کا ہر قدم اعجازی اور ہر دم آیت اللہ تھا۔ وہ اب بھی
زندہ اور قائم ہے اور بڑی تجلیات کے ساتھ آسمان سے نزول فرمائیگا بجلال
کون ایسا بدبخت ہوگا جو گوناگوں الٰہی جلال کو دیکھ کر پکار نہ اٹھے سے

کہ عدیم است عدیلش چوں خداوند کریم

تحدی

مگر ہاں جبکہ اسلام نے مسیح کی معجزانہ ولادت کو مذہباً مانا تو ہم نہایت
ادب سے دریافت کرتے ہیں کہ اس اعجازی ولادت کا راز اور مقصد کیا
ہے؟ اور کیوں سلسلہ قانون المسیح کی پیدائش میں ٹوٹا جبکہ بقائے جنس کا ایک
قانون جاری ہوا کہ درخت بیج اور حیوان ماں باپ کے نطفہ سے پیدا ہوں کس

صفائی سے قرآن کہتا ہے بدا خلق الانسان من طین شروع انسان
کی پیدائش مٹی سے ہے۔ ثم جعل نسلہ من سلالۃ من ماء مہین پھر بنائی
اُس کی اولاد نچڑتے پانی بے قدر سے (سجدہ ع۱) لیکن سوال یہ ہے کہ پیدائش مسیح
کیوں افزائش نسل آدم کے اٹل قانون کے تابع نہیں رکھے گئے؟ کیوں خدا
تعالے نے پسند نہیں کیا کہ اپنے کلمے کے کالبد کو اسی حقیر صلصال سے بنائے جس
سے آدم پیدا ہوئے یا اس ماء مہین سے بنائے جس سے نسل آدم کی افزائش
ہوتی؟ اگر یہ ایک معجزہ ہے تو کیا ایسا بڑا معجزہ اکارت جائیگا؟ کیا ایسے عظیم الشان
معجزے کا نتیجہ اور مقصد کچھ نہیں؟ کیا یہ محض تحیر کا کھیل تھا اور بس؟ نہیں ہرگز
نہیں۔ اس اعجازی ولادت کی بھی ایک غایت ہے جو تمام غایات سے ارفع
ہے۔ اس نورانی ظہور کا بھی ایک مقصد ہے جو تمام مقاصد سے بلند تر ہے
وہ کیا ہے؟ نجات

شفیع المذنبین

کلام مقدس میں آمدِ مسیح کا یہ مقصد ظاہر کیا گیا ہے کہ وہ نہ صرف نبیانہ عہد کو
پورا کریگا بلکہ قیدیوں کو رہائی، اندھوں کو بینائی اور کچلے ہوؤں کو آزاد کریگا۔ کیونکہ لوگ
کھوئی ہوئی بھیڑ کے مانند ہیں مگر وہ نہ صرف خود گم گشتگی سے آزاد ہے بلکہ بھیڑوں کا
چوپان بھی ہے اور لوگ بیمار ہیں مگر وہ نہ صرف تندرست ہے بلکہ حکیم حاذق بھی
ہے۔ اوروں کی زندگیاں اسیر ہو چکی ہیں مگر اس کی زندگی نہ صرف اسی
کے لئے ہے بلکہ اوروں کے فدیہ میں بھی دیجاتی ہے اور لوگ ہاں سب کے سب گنہگار
ہیں مگر وہ نہ صرف گناہ سے مبرا ہے بلکہ گنہگاروں کا نجات دہندہ بھی ہے اگر وہ

بحیثیت ایک شارع، بادشاہ، معلم، نبی یا ایک نمونہ کے آتا تو اُس میں انسان کے لئے کچھ تسلی نہ ہوتی۔ غذا اور پرہیز کے قوانین کمزوروں کے لئے مناسب ہیں لیکن جو شخص کہ بیماری میں مبتلا ہو اُس کے لئے کچھ مفید نہیں تاوقتیکہ گنہگار کے لئے پہلے شفا درکار ہے۔ بعد ازاں وہ قواعد و قوانین کی پابندی کریگا۔ جیسے اگر انسان کا کان سننے سے عاری ہو گیا ہو تو اُس پر دلآویز گیت کا اثر نہیں ہو سکتا اور نہ موسیقی کے میٹھے میٹھے زمزموں کی سروانی سے حظ اُٹھا سکتا ہے اگر دیکھنے سے لاچار ہے تو پہاڑ اور میدان کا دلکش نظارہ اُس کے لئے کچھ حقیقت نہیں رکھتا بہرہ دنیا سمعی کی طرف سے مُردہ ہے۔ اندھا دنیا بصری یا عینی کی طرف سے۔ اسی طرح گنہگار روحانی طور سے مُردہ ہے۔ جیسے بہرے کو کان کی صحت کی ضرورت ہے تاکہ اُس کا تعلق دنیا سمعی سے بحال ہو ویسے ہی گنہگار انسان کو بھی زندگی کی ضرورت ہے تاکہ اُس کی نوپید روحانی زندگی خدا کے ساتھ بحال اور وابستہ ہو اور خود خدا پاک

گناہ کی ہمہ گیری

یہ امر مبرہن ہے کہ حقیقی [illegible] خود زندگی [illegible] اس میں کوئی باطنی اصول زندگی موجود نہیں جس کی بدولت وہ خود بخود بغیر [illegible] الٰہی طبیعت میں داخل ہو جب تک کہ [illegible] بحال ہو چکے ہیں اُس کو [illegible] کی صورت [illegible] کی اسی طرح انسان کی بگڑی ہوئی طبیعت کی اصلاح کے لئے فوق الفطرت ہی کی ضرورت ہے جس سے اُس کی طبیعت کی اصلاح ہو جائے [illegible] پاداش سے کسی طرح بھی گنہگار کے لئے چھٹکارا حاصل کرنا ممکن نہیں کیونکہ انسانی زندگی بذات خود اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی۔ تاوقتیکہ [illegible] اس کی اندرونی [illegible] الٰہی [illegible] جیسے کوئی نئی دنیا خارجی [illegible] اختیار نہیں کر سکتی۔ جب تک کہ اُس کا وجود پہلے انسان کی ضمیر میں متشکل نہ ہو

اسی طرح کوئی شخص علی السبیل تواتر نیکی نہیں کر سکتا تاوقتیکہ وہ پہلے پاکیزگی کے چشمہ سے وابستہ نہ ہو کیونکہ گناہ آلودہ طبیعت سے حقیقی نیکی کا صدور محال ہے الغرض "جبشی جس طرح اپنے چمڑے کو یا چیتا اپنے داغوں کو بدل سکے تو تم بھی جو بدی کے عادی ہو نیکی کر سکو گے"۔ پس اگر گناہ کا ازالہ انسانی کوشش سے ممکن ہوتا تو کیوں آج تک اخلاقی۔ تمدنی۔ معاشرتی۔ سیاسی اور مذہبی پابندیاں اسے مٹا نہ سکیں بلکہ سچ تو یہ ہے کہ

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

چنانچہ تجربہ و مشاہدات سے یہ ثابت ہے کہ ہر شخص خواہ نبی ہو یا ولی گناہ کی طرف ایسا مائل ہے کہ گناہ اُس کو خلاف طبع محسوس نہیں ہوتا۔ اور بغیر کسی اکساہٹ اپنی خواہش ہی سے جیسے کہ گناہ کا مرتکب ہوتا ہے مگر اس کے برعکس حقیقی نیکی ہے ایک بوجھ معلوم ہوتی ہے اور دل کو اس کے لئے مجبور کرنے کی ضرورت ہوتی ہے ہم انسان [illegible] عرفی نیکیوں کا ذخیرہ جمع کر کے گندہ ہوں اور مظالم کا بھاری بوجھ کاندھے سے اور معصیت کی پوٹ سینہ سے اتارنا چاہتا ہے مگر اس کا نام نجات نہیں بلکہ نجات سے بھاگنا ہے۔ نجات کا مفہوم صرف یہی نہیں کہ انسان خدا کی غضب سے بچ جائے بلکہ یہ کہ گنہگار الٰہی طبیعت حاصل کرے۔ ورنہ وصال خداوندی سے محروم رہیگا بلکہ اس لئے بھی کہ الٰہی طبیعت حاصل کئے بغیر محض تقرب سے کسی طرح کی خوشی کا حصول محال ہے کیونکہ خوشی کا [illegible] محض [illegible] بہشت کے [illegible] میں نہیں بلکہ تم موافق طبع کے ملنے پر ہے۔ اگر شیطان صحبت الٰہی میں بھی رہے تو وہ اپنے طبعی بگاڑ کی وجہ سے الٰہی حضوری میں مسرت کی بجائے اضطراب محسوس کریگا۔ لہٰذا اجتماع ضدین محال ہے۔ اگر یہ ممکن ہوتا گنہگار مخالف طبع رکھنے کے باوجود خدا سے وصال کرنے کے قابل ہوتا تو پھر حضرت آدم یک ہی نافرمانی کے

باعث الٰہی حضوری سے خارج ہو گئے اور وہ شے جو اُن کے لئے خوشی اور راحت کا سبب تھی کیوں وجہ مفارقت ٹھہری؟ لہٰذا ضرورت ہے کہ انسان گناہ کے اختیار سے چھوٹ کر راستباز بن جائے اور یہ بذریعہ نیک اعمال ممکن نہیں کیونکہ خوبیٔ نیکی دل کی پاکیزگی پر موقوف ہے یعنی بگڑی ہوئی طبیعت سے حقیقی نیکی کا صدور اور الٰہی طبیعت کا حصول ممکن نہیں اس لئے طبعی بگاڑ سے چھٹکارا پانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ انسان کی طبیعت کسی ایسی فوق الفطرت تاثیر سے متاثر ہو جس سے اُس کی طبیعت کی اصلاح ہو جائے یہ فوق الفطرت کلام مقدس کے بموجب ربنا المسیح ہے جو خدا کی محبت اور انسان کے گناہ کو خدا کے رحم اور انسان کی عاجزی کو اور خدا کی پاکیزگی اور انسان کی نجاست کو ظاہر کرتا ہے

ضرورتِ تجسم

پس یہاں حضور مسیح کے اعجازی تولد کی ضرورت کا پتہ ہمیں ملتا ہے اگر وہ ہم کو پستی سے اٹھانے آیا تھا تو ضرور تھا کہ وہ خود اس پستی سے بالا ہو۔ اگر وہ ہم کو گناہ کی قید سے رہا کرنے آیا تھا تو ضرور تھا کہ خود قیدِ گناہ سے رہا ہو۔ لیکن یہ کس طرح ممکن تھا اگر وہ خود اسی نسل سے ہوتا جو گناہ سے گمراہ رہی ہے اور پھر کس طرح ممکن تھا کہ گناہ اور موت کا سایہ انسان سے دور ہو۔ یہ صرف اسی طرح ممکن تھا۔ کہ اس کی پیدائش انسانی پیدائش سے بلند و بالا ہو۔ یعنی ایک ایسی مقدس کنواری سے معجزانہ پیدا ہو جو اپنا دامن نچوڑے تو فرشتے وضو کرنا باعثِ فخر سمجھیں اور یوں وہ خود مقدس اپنی والدہ کے رشتہ سے انسان ہوگا۔ لیکن اس میں وہ داغ نہ ہوگا۔ جو آدم کے گناہ کے وقت سے چلا آتا ہے۔ فی الحقیقت ایسا ہی سردار کاہن ہمارے لائق تھا کہ جو پاک اور بے عیب اور گنہگاروں سے جدا ہو لیکن ایسی شخصیت کا انسانی وجود میں آنا کس طرح ظاہر کیا جاتا اور دنیا کو کیونکر معلوم

ہوتا کہ اس کی پیدائش کا سرچشمہ کوئی انسان نہیں؟ ایسے سوالات کے جوابات جب خدا خود دیتا ہے تو ہماری سمجھ میں آتا ہے کہ کنواری سے جنم لینے کا بہترین طریقہ یہی تھا کہ فطرت ایسی شخصیت کو قبول کرتے وقت اپنے معمولی قواعد اور قوانین کو رد کر دے کہ اس ذاتِ پاک کا مناسب استقبال ہو۔

بے مثل آفاقی

علاوہ بریں جب ہم حضور مسیح کے اعجازی پیدائش کے نتائج دیکھتے ہیں۔ تو اس کے معنی زیادہ ہماری سمجھ میں آتے ہیں۔ ہزاروں برس کے فاصلے پر کھڑے ہو کر ہم دیکھ سکتے ہیں کہ کوئی ایسا شخص آج تک پیدا نہیں ہوا جس کی زندگی کے نتائج اور تاثرات انسان کے لئے حوصلہ افزا ہوں۔ دنیا میں سیدنا المسیح سے پہلے اور بعد بڑے بڑے مدبر، شاعر فلاسفر، فاتح اور مصلح ہو گزرے لیکن ان میں کون ایسا گزرا ہے جو حضور مسیح کے برابر کام کر گیا ہو۔ نپولین اول نے کہا سکندر، قیصر اور میں نے چاہا کہ تلوار کے زور سے دنیا کو فتح کریں لیکن نہ کر سکے۔ بلکہ زیادہ کی ہوس میں تھوڑی بھی کھو دی لیکن ایک ہے جس نے کبھی تلوار ہاتھ میں نہ لی مگر اُس کی سلطنت بڑی ہے ہماری بادشاہت چند روزہ تھی۔ مگر مسیح کی بادشاہت قائم اور ترقی پذیر ہے۔ ہماری سلطنت کا انحصار ہماری تلوار تھی۔ لیکن مسیح اپنی خودداری کے ذریعہ حکومت کر رہا ہے فاتحین کے علاوہ دنیا بڑے سے بڑے عاقل اور عالم دیکھ چکی ہے لیکن ان میں کتنے گزرے ہیں۔ جن کے سامنے دنیا ایسی خم ہو رہی ہے جیسی حضور مسیح کے آگے۔ البتہ مشاہیر عالم کی قدر و منزلت بڑی ہے لیکن حضور مسیح جیسی سربلندی کہاں۔ جس کے سامنے ملائکہ تک سربسجود ہیں۔ وہی اکیلا وجیہاً فی الدنیا والآخرۃ کے القاب سے ملقب ہے۔

افلاطون، شکسپیر، حافظ شیرازی، کالی داس، غالب اور اقبال کا کون

فائق نہیں لیکن انکا اثر کلمۃ اللہ کے اثر سے بالکل مختلف ہے۔ شاعر اور فلاسفر انسان کے ذہن پر اپنی دھاک بٹھا سکتے ہیں۔ مگر مرضی پر نہیں لیکن کلمۃ اللہ اس کے برعکس انسان کی مرضی اور مشیت پر غالب آتا ہے۔ بلکہ ہمارے اندر زندگی کا دم پھونکتا ہے ہماری روح میں بذریعہ ہماری روح کے اُس کی روح کام کرتی ہے۔ اُس کی مرضی ہماری مرضی کے اندر۔ اُس کا پاک اور بیگناہ نیچر ہمارے بگڑے ہوئے نیچر کو اُٹھاتا اور قیام بخشتا ہے۔ جیسے مضبوط مرضی کمزور مرضی پر اثر کرتی ہے۔ ویسے ربنا المسیح کی اعلیٰ زندگی ہماری ادنیٰ زندگی کو متبدل اور بلند کرتی ہے یا جیسے کڑوا درخت صرف میٹھے درخت سے پیوند ہو کر میٹھا پھل دیتا ہے اور یوں اُس کا اپنا کڑوا سبھاؤ یا خاصیت مرجاتی ہے اور میٹھے درخت کی خاصیت اس میں آجاتی ہے۔ اسی طرح کلمۃ اللہ اُن زندگیوں کو پیدا کرتا ہے جو اُس سے پیوست ہیں

آئیے ربنا المسیح کا مقابلہ نبیوں اور فلسفیوں سے بھی کیجئے۔ آپ دیکھینگے کہ وہ زندگی کے دروازے سے ہماری دُنیا میں داخل ہوئے اور موت کے پھاٹک سے غائب ہو گئے۔ ابوالبشر آدم کی طرح بھٹکتے ہوئے خدا کے آگے گر کر کہتے رہے ربنا

ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا وَإِنْ لَمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ

اے ہمارے ربّ ہم نے بُرا کیا اپنی جان کا اور اگر تو نہ بخشے ہم کو اور ہم پر رحم نہ کرے تو ہم ہو جائینگے نامراد (اعراف ع ۲) اور اُن کے ماننے والوں سے پوچھئے کہ آپ کدھر جارہے ہیں۔ اور آپ کو آنے والا زمانہ کیسا دکھائی دیتا ہے اُن کی زبان گنگ ہو جائیگی۔ اور وہ ورطۂ حیرت میں ڈوب جائینگے کہ وہ کدھر اور کس اُمید پر جارہے ہیں۔ لیکن برخلاف اس کے ہم مسیحی اس امر پر تکیہ کر سکتے ہیں۔ کہ ہمارا نجات دہندہ زندہ ہے اور اُن سب کو بچانے پر قادر ہے۔ جو اُس کے

وسیلے خدا کے پاس آتے ہیں"۔ (عبرانیوں ۷: ۲۵) کیونکہ "وہ آج اور کل بلکہ ابد تک یکساں ہے"۔

یہ خیال کیسا مبارک ہے کہ ہمارا نجات دہندہ گو اب غیر مرئی ہے۔ تاہم وہ فی الحقیقت زندہ شخص ہے۔ ہم ایسے مسکن کی طرف سفر کر رہے ہیں جہاں ہمارا بہترین دوست ہمارے لئے جگہ تیار کرنے گیا ہے۔ (یوحنا ۱۴: ۲) وہ پیشرو ہو کر وہاں جا پہنچا ہے۔ اور اُس نے ساری چیزیں تیار کر رکھی ہیں۔ اسی باعث رسول نے فرمایا کہ "کون ہے جو ہمیں مجرم ٹھہرائیگا۔ مسیح یسوع وہ ہے جو مر گیا بلکہ مُردوں میں سے جی بھی اُٹھا اور خدا کی دہنی طرف بیٹھا ہے اور ہماری شفاعت بھی کرتا ہے (رومیوں ۸: ۳۴)

فیوض و برکات

تاریخ عالم شاہد ہے کہ مسیح کی پیدائش کے وقت سے وہ تمام خوبیاں اور اُمیدیں نمودار ہوئیں جو موجودہ دُنیا کی تہذیب کے سب سے خوبصورت زیور ہیں۔ اگر بعض صحت بخش قوانین مسیح سے پہلے بھی دُنیا میں رائج تھے لیکن ترقی کا لفظ اُن کی لغت میں نہیں ملتا۔ لیکن حضور مسیح کا کلام ایسا مؤثر اور ترقی پذیر ہے کہ جس نے مُردہ قوموں کے دلوں میں نئی جان ڈالدی اور ڈال رہا ہے۔

ربنا المسیح کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اُس نے انسانی شخصیت کی عظمت کا سبق تاریخ عالم میں سب سے پہلی مرتبہ دیا۔ آپ سے پہلے ہی ساری مہذب دُنیا پر نظر دوڑائیے۔ یونان کا فلاسفر ارسطو یہ کہتا ہوا نظر آئے گا کہ یونانیوں کے لئے غیر ملکیوں کے ساتھ وہی برتاؤ واجب ہے جو وہ حیوانات کے ساتھ کرتے ہیں۔ رومی شوکت اور تمدن کے علمبردار نوع انسان کو غلام بنانے اور اُن کو خونخوار درندوں سے پھڑوا دینے کے لئے تقریریں کرتے ہوئے نظر آئینگے

ہندوستان میں کرشن مہاراج نہایت استقلال و متانت سے ارجن کو اپنے ہی بھائیوں کے خلاف تلوار چلانے کے لئے ابھارتے اور اشتعال دلاتے نظر آئینگے۔ عرب کا اُمّی نبی اپنے اللہ کے حکم کے مطابق کافروں اور منافقوں سے جہاد کرتے ہوئے۔ (سورہ تحریم آیت ۹) اور مسلمانوں کو لڑائی پر ابھارتے (سورہ انفال آیت ۶۵ تا ۶۸) ہوئے دکھائی دینگے۔ اس کے برعکس حضور مسیح نہایت ملائم اور شفقت آمیز لہجے میں یہ فرماتے ہیں کہ "تمہارے آسمانی باپ کی یہ مرضی نہیں کہ ان چھوٹوں میں سے کوئی ہلاک ہو" سچ تو یہ ہے کہ خود اذیتیں سہیں مگر مدافعت کے لئے ہاتھ نہ اٹھایا۔ ستم سہے اور کرم کئے۔ گالیاں سنیں کسی کا گلہ کاٹنے کا تو کیا ذکر خود اپنا گلا کٹوا لیا۔ اور دوست و دشمن کی خاطر اپنی جان دے دی۔

احترامِ نفس

کلمۃ اللہ نے احترامِ نفس کا سبق دیکر ہر قسم کی خونریزی اور ایذا رسانی کو بند کر دیا۔ پہلے سب سے زیادہ قابلِ عزت ہستی وہ کہلاتی تھی جس نے زیادہ سے زیادہ انسانی زندگیوں کو موت کے گھاٹ اتارا ہو جس نے شہر کے شہر تاخت و تاراج کئے ہوں جس نے ہزاروں [illegible] میں غلام بنایا ہو۔ لیکن مسیحیت کا بانی اپنی ظفر مندی اور کامرانی کا معیار یوں پیش کرتا ہے کہ "ابنِ آدم اس لئے آیا کہ اپنی جان بہتیروں کے بدلے فدیہ میں دے" اور اعلان فرمایا کہ "جو کوئی اپنی جان بچانے کی کوشش کریگا۔ وہ اُسے کھوئیگا اور جو اُسے کھوئیگا وہ اُس کو بچائیگا۔" اس اعلان کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگوں میں جانثاری کا جذبہ آ گیا۔ اور مسیحیوں نے دنیا کی بھلائی کے لئے اپنا تن من اور دھن لگا دیا۔ غرضیکہ مسیحیت کی رو سے کامیاب شخص وہ ہے جو اوروں کی بہتری کے لئے سب کچھ حتیٰ کہ اپنی قیمتی جان تک قربان کر دے

کیونکہ بدی کا جواب نیکی ہو تو ایسا پروگرام افراد اور اقوام کی زندگی اور بقا کا موجب ہوتا ہے۔ لیکن اگر بدی کا جواب بدی سے دیا جائے اور اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جائے تو ایسا لائحہ عمل افراد اور اقوام کے فنا کا باعث ہوتا ہے۔ خود اپنے ملک [illegible] کستان کے دورِ حاضرہ کی تاریخ پر نگاہ کرو۔ تو اس صداقت کی مثال پاؤگے۔ ہندوستان [illegible] ملک نے عدم تشدد کو اختیار کر کے بقا اور زندگی حاصل کی۔ بلکہ دنیا پر ثابت کر دیا کہ صرف کلمۃ اللہ کے اصول صبر و ضبط کے ذریعے دنیا امنِ عامہ قائم کر سکتی ہے۔

آمدِ [illegible] مجسم سے پہلے انسانیت کی چند جماعتیں ایسی تھیں جن کی زندگی اور مال و جان کے ساتھ ہر قسم کا بُرا سلوک جائز سمجھا جاتا تھا گویا وہ ظلم و تشدد اور چیرہ دستی کے لئے تختۂ مشق بنائے جاتے تھے۔ اس مظلوم طبقہ میں وہ گروہ بھی شامل تھا جسے عورت کے نام سے نامزد کیا جاتا ہے۔

چنانچہ کلمۃ اللہ سے پیشتر بنی اسرائیل کے درمیان عورت مرد کی خادم تصور کی جاتی تھی۔ بُت پرستوں کے درمیان جیسا کہ آجکل ایشیا کی تمام اقوام میں وہ عام طور پر مرد کی داسی سمجھی جاتی ہے اور اسلام میں عورت کھیتی کا درجہ رکھتی ہے۔ (البقرہ آیت ۲۲۲) مرد عورتوں پر حاکم ہیں (نساء آیت ۳۴) شوہر اپنی بیوی کو مار پیٹ سکتا ہے ایک کی بجائے دوسری بدل سکتا ہے۔ (نساء ع) طلاق دے سکتا ہے (نساء) ایک ہی وقت میں چار چار بیویاں نکاح میں لا سکتا ہے اور اس کے علاوہ لونڈیاں بھی رکھ سکتا ہے۔ (سورہ نساء آیۃ ۳) اگرچہ بعض عورتیں اپنی لیاقت اور خاندانی عزت کے باعث اپنے درجہ سے بڑھ کر مردوں کے پہلو بہ پہلو نظر آتی ہیں۔ لیکن عام طور پر مرد کا کھلونا سمجھی جاتی ہے لیکن جب کلمۃ اللہ نے بنی آدم کا چھٹکارا اپنے ذمے لیا تو اس نے کنواری کے رحم سے

نفرت نہ تھی جس کے باعث مقدسہ مریم میں کُل عورتوں کی ذات بلند ہوئی اُس کو وہ درجہ ملا جو کبھی کسی کے خواب و خیال میں نہ تھا اور ایسا اعلیٰ درجہ کوئی اُس سے چھین نہیں سکتا۔ غرضیکہ مسیحی نفع عمل کا دائرہ میدان جنگ نہیں۔ بلکہ غربا کی مدد بیماروں کی تیمارداری اور مظلوم و متروک کی خبرگیری ہے مسیحیت کا ایک خاص کارنامہ یہ ہے کہ اس نے نسلی غرور اور رعونت کا ہی خاتمہ کر کے اُس کی جگہ حلم و انکسار، خلق و تپاک، تسلیم و رضا، اُلفت و محبت کے جذبات کو روزمرہ زندگی کے فرائض کے ساتھ وابستہ کر دیا۔

خداوندی ملاپ

یہ صرف حضور مسیح کی تعلیم کے بیرونی نتائج ہیں۔ لیکن تھا کہ ایسے اثر اور نتائج کسی زبردست مذہبی مدبّر اور مصلح کی حکمت سے برآمد ہوتے۔ ان باتوں کے لئے خدا کے مجسم ہونے کی ضرورت نہ تھی۔ حضور مسیح کے تجسم نے انسانی احترام کے علاوہ اور بہت بڑے بڑے کام کئے۔ کلمۃ اللہ اس لئے مجسم ہو کر انسانیت میں داخل ہوئے کہ ہماری انسانیت بلند ہو۔ خدا نے ہمارے نیچر کو اس لئے لیا کہ وہ ہم پر ظاہر ہو اور وہ دیوار جو خدا اور انسان کے درمیان ہے، اُٹھ جائے۔

اس میں شک نہیں کہ حضور مسیح سے پیشتر بھی انسان خدا کی ہستی سے واقف تھا اور اُس کی عبادت کرتا تھا لیکن اس کے باوجود خالق اور مخلوق کے درمیان ایک دیوار تھی لیکن کلمۃ اللہ کے تجسم نے خالق اور مخلوق کا ملاپ کرا دیا ہے۔ آسمان اور زمین میں اب ایسا دیوار کا سا فرق نہیں۔ لہذا حضور مسیح کی عظمت اُس کی لاثانی تعلیم سے نہیں۔ بلکہ اُس کی ذات سے ظاہر ہوتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ بذات خود مجسم تعلیم تھا وہ محض نئے خیالات کا فیلسوف نہ تھا۔ بلکہ سرتاپا مجسم ایک مکاشفہ تھا۔ وہ صرف خوشخبری دینے والا نہ تھا۔ بلکہ خود خوشخبری تھا وہ

صرف خدا کا کلام سنانے والا نبی نہ تھا۔ بلکہ مجسم خدا کا کلام تھا وہ صرف انجیل لیکر دنیا میں نہ آیا تھا بلکہ خدا کو لیکر آیا تھا۔ درحقیقت وہ انسانیت کے پردے میں خدائے ذوالجلال تھا "میں اور باپ ایک ہیں" (یوحنا) "میں باپ میں ہوں اور باپ مجھ میں ہے" (یوحنا) "میں خدا میں سے نکلا اور آیا ہوں" (یوحنا) "جس نے مجھے دیکھا اُس نے باپ کو دیکھا" (یوحنا) اور بقول شخصے

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے کبھی ہم اُنکو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

پدرانہ محبت

اب تک میں یہ ثابت کرنے میں کسی حد تک کامیاب ہو چکا ہوں کہ تجسم میں خدا کی محبت کا سماں ہماری آنکھوں کے سامنے بندھ جاتا ہے کہ کس طرح خدا نے المسیح میں ہمیں پیار کیا۔ ہماری نجات کا بندوبست کیا۔ اب کس طرح سے اپنے پاس بلاتا ہے اور کس طرح سے مسیح میں انسانی ذات، انسانی صورت اور انسانی زبان اختیار کرتا ہے اگر ہر برگ و ثمر میں نقش کردگار نظر آتے ہیں۔ تو کیوں خدا کا انسانی جامہ پہننا غیر ممکن تصور کیا جائے جبکہ وہ اپنے کیرکٹر کے ظاہر کرنے کے لئے کرے۔

یہ نہیں کہ تجسم میں خدا خدا نہیں رہتا اور نہ ہی وہ منقسم ہوتا ہے۔ بلکہ یہ کہ تجسم میں خدا کی اندیکھی صفتیں صاف نظر آتی ہیں کیونکہ الوہیت کی ساری معموری کلمۃ اللہ میں مجسم ہو کر سکونت کرتی ہے۔ پس تجسم میں خدا اپنی لاانتہا صفات کو جو ہماری سمجھ میں نہ آ سکتی تھیں اُن کو برطرف کیا۔ اور ہماری مانند بشر بن کر ہم پر اپنی محبت اور رحم کو ظاہر کیا۔ جیسے دوربین کسی نئے ستارے کو پیدا نہیں کرتی بلکہ اُن ستاروں کو جو بسبب دوری کے ہمیں دکھائی نہیں دیتے ہم پر ظاہر کرتی ہے یا جیسے سورج اپنی چمک اور تیز روشنی سے ہماری آنکھوں کو چندھیا دیتا ہے مگر اب ایسے آلے ایجاد ہو چکے ہیں جس سے ہم سورج کو صفائی سے دیکھ سکتے ہیں

ہومر ایک واقعہ بڑی دلچسپی سے لکھتا ہے کہ ہیکٹر ٹرائے جب اپنے دشمن کے مقابل میں نکلنے کو تیار تھا۔ تو اُس کی بیوی مع اپنے بچے کے الوداع کہنے آئی ہیکٹر ٹرائے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر بچے کی طرف بڑھا۔ مگر بچہ اپنے باپ کی آہنی کی زرہ بکتر چمکتی ہوئی خود اور ہوا میں اڑتا ہوا پھندنا دیکھ کر اس قدر ڈر گیا کہ چیخ مار کر اپنی دایہ سے چمٹ گیا۔ تب ہیکٹر نے اپنی خود اتاری اور بڑے پیار سے بچے کو بلایا۔ جوں ہی بچے نے اپنے باپ کو پہچانا تو ہنستے اور کھلکھلاتے باپ کی گود میں لپک پڑا۔ اسی طرح بنی اسرائیل خدا کے اس جلال کو جو کوہ سینا پر ظاہر ہوا۔ دیکھ کر ڈر گئے (عبرانیوں ۱۲:۱۸) لیکن اب وہی خدا جس کے جلال جاہ و جلال سے آنکھیں چندھیا جاتی تھیں۔ المسیح میں ایک ایسے خوش پیرایہ میں نظر آتا ہے۔ جیسے سورج کی کرن قوس و قزح میں۔ خدا کی لامتناہی محبت خداوند مسیح میں ایسی ظہور پذیر ہے جس کو ہم آنکھوں سے دیکھ سکتے کانوں سے سن سکتے اور دل سے محسوس کر سکتے ہیں۔ گویا کہ وہ خدا جو گناہ سے نفرت رکھتا ہے اب المسیح میں انہی سے محبت کرتا ہے جو محبت کرنے کے لائق نہ تھے وہ خدا جس کی شان و شوکت پر نظر نہ ٹھہرتی تھی۔ اب وہی اپنے آپ کو خالی کر کے انسانوں کے مشابہ ہو گیا۔ کہ انہیں جلال میں داخل کرے۔

عام ہے یار کی تجلی مہر
خاص ہوتے وہ کوہ طور نہیں

اگرچہ یہ سچ ہے کہ خدا رحیم و کریم اور غفور ہے۔ لیکن کس طرح یقین آئے کہ وہ رحیم و غفور ہے اگر وہ آسمان پر جلوہ گر رہ کر ہمارے پیچھے سی۔ آئی۔ ڈی جیسے شرعی زبان میں کراماً کاتبین کہتے ہیں چھوڑ دے کہ دیکھا ہو اور لوگوں کے نامۂ اعمال لکھو۔ کیا خدا کا یہی کام ہے کہ کسی کو سزا دے اور کسی کو جزا؟ اگر خدا رحیم ہے تو ضرور ہے کہ وہ ہمارے درمیان رہ کر ہماری کمزوریوں کا چارہ ساز ہو

ایک نوکر کو اس امر سے بحث نہیں ہوتی کہ آیا مالک حسین ہے کہ نہیں آیا وہ بانکا ہے کہ ترچھا۔ اس کا کتنا اقتدار ہے آیا وہ دولتمند ہے کہ نہیں بلکہ وہ یہ دیکھتا ہے کہ مالک کا سلوک میرے ساتھ کیسا ہے اُس کے تعلقات میرے ساتھ کیسے ہیں۔ آیا محبت پر یا سختی پر مبنی ہیں۔

عزیزو! ہمارا خدا صرف بلند مقاموں میں رہنے والا نہیں بلکہ وہ مجسم ہو کر ہماری زمین پر مارا مارا پھرا۔ اُسے اپنی پیاری مخلوق کے ساتھ عشق ہے۔ اگر وہ کسی کو کبیدہ خاطر دیکھتا تو اُس کے دل کو ٹھیس لگتی۔ اگر کسی کی پیشانی پر بل یا کسی کے چہرے کو پُرملال پاتا تو بیقرار ہوتا اور جب دُکھ اور درد کمزوریوں اور بیماریوں میں مبتلا اُس کے سامنے آتے تو انہیں اچھا کرتا۔ جب اُس نے لعزر کی موت کی خبر سنی تو رو دیا۔ اُس کے دل میں درد تھا۔ گداز تھا۔ اُس کے پیار و رحم کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ وہ پُرمحبت ہے۔ خواہ ہم اُس سے محبت رکھیں یا نہ رکھیں۔ وہ ہر حال میں ہم سے محبت رکھتا ہے۔ خدا اپنی محبت کی خوبی ہم پر یوں ظاہر کرتا ہے۔ کہ جب ہم گنہگار ہی تھے۔ تو مسیح ہماری خاطر موا۔ مانا کہ انسان بڑا سرکش ہے لیکن خدا کا پدرانہ دل کب یہ گوارا کر سکتا تھا جس نے ہم کو اشرف المخلوقات بنایا وہ دوزخ ایندھن بن جائے۔ جیسے باپ اپنے بیٹوں پر ترس کھاتا ہے۔ ویسے ہی خدا بھی گنہگاروں پر ترس کھاتا ہے۔ اسی لیے مسیح میں خدا انسانی ذات، انسانی صورت اور انسانی زبان اختیار کرتا ہے۔ تاکہ ہمیں آسمانی خوشیوں سے مالا مال کرے۔

یہ محض ہمارا دعویٰ ہی نہیں ذرا مسیحیت کی تواریخ کی ورق گردانی کیجیے وہ شروع سے لے کر آج تک ناممکنات کی فتح و نصرت کے کارناموں سے لبریز ہے۔ گناہ آلودہ لوگ اُس کے نور سے منور ہوئے۔ بیماروں نے شفا پائی

جلوہ ہائے حقیقت دیکھے اسرارِ معرفت سمجھے عالمِ رُوحانی کی سیر کی حیاتِ جاودانی پائی۔ نغمہ ہائے محبت سے سرمست ہوئے۔

دوستو! ہم صرف کلمۃ اللہ کی قوت میں ٹھہر سکتے ہیں ”آسمان کے نیچے کوئی دُوسرا نام نہیں بخشا جس کے وسیلے سے ہم نجات پا سکیں“۔ (اعمال ۴: ۱۲) دُنیا میں کوئی اور طاقت نہیں جو انسان کی مادیت کا انسداد کر سکے یا اس میں بلند نظری پیدا کر سکے۔ وُہی ایک ایسے باغبان کی طرح ہے جو جنگلی گلاب میں اصلی گلاب کی لہر دوڑاتا ہے۔ کیونکہ المسیح انسان میں بستا ہے۔ اس میں خیال کرتا ہے اور یُوں اُس کے خیال ہمارے خیال ہو جاتے ہیں۔ اُس کی زندگی ہماری زندگی ہو جاتی ہے یہ کیسا بھاری فضل ہے کیسی گہری برکت ہے۔ کون ہے جو ذرہ کو اُٹھا کر آفتاب کر دے اور خاک کو اکسیرِ اعظم بنا دے۔

”پس اتنی بڑی نجات سے غافل رہ کر ہم کیونکر بچ سکتے ہیں“۔ اس لئے آؤ اور اپنی جبینِ نیاز آستانۂ مسیح پر رکھ دو۔ وُہی تمہاری رُوحوں کو سکون بخشیگا۔ وُہی تمہارے قلبِ تاریک کو جگمگا دیگا۔ وُہ اِسی لئے ابنِ مریم بنا تاکہ ہمیں آسمانی خوشیوں سے مالا مال کرے۔ اُس نے اپنے آپ کو اس لئے پست کیا کہ ہمیں آسمانی مقاموں پر پہنچائے۔ بغرض اِس سے باہر موت اور ہلاکت کی وادی ہے چنانچہ اِس ظلمت کدہ کے بسنے والوں میں جتنوں نے اُسے قبول کیا اُس نے اُنہیں خدا کے بیٹے ہونے کا حق بخشا۔ ”عالمِ بالا پر خدا کی تمجید اور زمین پر اُن آدمیوں میں جن سے وہ راضی ہے صلح“۔ وَمَا عَلَیْنَا اِلَّا الْبَلَاغ ۔

*

تقریظ

از مولوی ایم۔ این۔ شریف منشی فاضل و مولوی کامل کا

جس طرح بارش کے لطیف قطرے اس خاکدان ہوا کے لئے شادابی کا پیام لاتے ہیں۔ اسی طرح انبیاء اور مرسلین ایزدی نفوس کی تیرگی کو دُور کر کے وہ جلا بخشتے ہیں کہ یہ ذلیل مخلوق رنگ مقدس کا رتبہ حاصل کر لیتی ہے۔

قیاس کی دسترس سے بہت بعید ہے۔ قلب کا وہ مرتبہ جب وہ کسی مردِ کامل کی نظر کا شکار ہو کر جلال خداوندی اور پرتو صفاتِ ایزدی کا مرکز بن جائے۔

کس بلندی پہ ہے مقامِ مرا　　عرش ربِّ جلیل کا ہوں میں

وہ مردانِ کامل جن کو مذہبی اصطلاح کی زبان میں نبی یا رسول یا پیغمبر کے نام سے یاد کیا گیا ہے بشریت کے لحاظ سے ہمارے ہمجنس ہوتے ہیں۔ فطری احتیاجات میں وہ ہم سے فوقیت نہیں رکھتے نہ اُن کی پیدائش و موت کا طریقہ ہم سے جُداگانہ ہے نہ اُن کی دُنیاوی زندگی ایسی خلافِ عادت یا حیرت خیز ہوتی ہے کہ اُنہیں ہم سے مافوق ٹھہرائے۔ ہاں ایک چیز ہے جو اس دُنیا میں اُن کو نوعِ انسان سے کیا کائنات کے ذرہ ذرہ سے مافوق بنا دیتی ہے۔ وہ اُنکا ذاتِ احدیت سے رُوحانی تعلق ہے۔

اس قسم کے کمالِ رُوحانیت کے لحاظ سے تو ہر نبی ہی نوعِ انسانیت سے فضیلت رکھتا ہے۔ مگر ایک ایسی ذات ہی نظر آتی ہے جو تقاضا ہائے فطرت کے لحاظ سے بھی نوعِ خصوصیات سے متفرق ہے۔ وہ جناب عیسیٰ ابنِ مریم ہیں۔ آپ کی